مرزا فرحت اللہ بیگ

نامی انصاری

ہندستانی ادب کے معمار

مرزا فرحت اللہ بیگ

هندستانی ادب کے معمار

مرزا فرحت اللہ بیگ

نامی انصاری

ساہتیہ اکادمی

Mirza Farhatullah Beg : A monograph in Urdu by Nami Ansari on the Urdu author. Sahitya Akademi, New Delhi (2001), Rs. 25.

پہلا ایڈیشن : ۲۰۰۱ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون - ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس :

'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر:

جیون تارا بھون، ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھر الے مارگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور ۵۶۰۰۰۱

سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چنئی ۶۰۰۰۱۳

قیمت : ۲۵ روپے

ISBN 81-260-1156-4

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد سالم ۲۱۶/۲۷ ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱

طباعت : کلر پرنٹر، دہلی ۱۱۰۰۳۲

فہرست

مختصر تعارف

بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ، اردو زبان و ادب اور شاعری کے لیے بڑا سازگار زمانہ تھا۔ شعر و ادب کی پرانی بساط اٹھ چکی تھی اور مغربی طرز فکر کے اثرات سے اردو زبان و ادب میں بھی دور رس تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ حالی، شبلی، سر سید، نذیر احمد اور اقبال سے لے کر عبدالحلیم شرر، چکبست، جوش اور پریم چند کے یہاں ان نئی کروٹوں کے اثرات صاف طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

شعر و ادب کے اس رنگا رنگ منظر نامے میں مرزا فرحت اللہ بیگ بھی اپنی پُر بہار تحریروں کی وجہ سے بہت نمایاں اور بڑی حد تک منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کی شہرت کی اصل بنیاد "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" پر قائم ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں دہلی میں رہ کر نذیر احمد سے عربی کا درس لیا تھا اور اس دوران اپنے طور پر ان کی شخصیت اور سیرت کا بہت نزدیک سے مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نذیر احمد کا جو مرقع تیار کیا وہ عام و خاص سبھی کو بہت پسند آیا اور ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔

ان کا دوسرا کارنامہ "دہلی کی آخری شمع" یا "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ہے جس میں انھوں نے ۱۸۴۵ء کے ایک فرضی مشاعرے کی روداد اس طرح بیان کی ہے کہ اس مشاعرے کا ایک جیتا جاگتا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مولوی کریم الدین کے ایک معروف تذکرے "طبقاتِ شعرائے ہند" اور مولانا محمد حسین آزاد کے "آبِ حیات" کی مدد سے اس دور کے شعراء کی جو قلمی تصویریں کھینچی ہیں، وہ اپنی

مثال آپ ہیں۔ اس یادگار مشاعرے میں ایک ڈرامائی فضا ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو کئی مرتبہ اسٹیج پر بھی کامیابی سے پیش کیا جاچکا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا تیسرا بڑا کارنامہ ''پھول والوں کی سیر'' ہے جس میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے اس میلے کو نہ صرف تحریری طور سے زندہ کر دیا ہے بلکہ قومی یک جہتی کی ایک منہ بولتی تصویر بھی پیش کر دی ہے۔ پھول والوں کی سیر کا میلہ آج بھی ماہ اکتوبر میں ہر سال مہرولی (دہلی) میں منعقد ہوتا ہے جس میں پھول والوں کا ایک پنکھا حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر اور دوسرا پنکھا جوگ مایا کے مندر پر چڑھایا جاتا ہے اور اس طرح یہ میلہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یک جہتی کی ایک روشن علامت کے طور پر ابھرا ہے لیکن بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا جس میں خود بادشاہ، ولی عہد اور ان کے دربار کے اراکین بھی شامل ہوتے تھے اور اپنی ہندو مسلم رعایا کے بیچ میں جاکر خلوص و محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے تھے۔ آزادی سے بہت پہلے یہ میلہ ختم ہو گیا تھا لیکن جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی کوششوں سے یہ میلہ قومی اتحاد کے اظہار کے طور پر پھر سے مہرولی میں لگنے لگا جس میں دلّی کے لفٹنٹ گورنر بذاتِ خود شریک ہوتے ہیں اور کچھ مخصوص قائدین کو پھولوں کے پنکھے علامت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ کے کھاتے میں صرف یہی تین چیزیں نہیں ہیں بلکہ مضامینِ فرحت کی سات جلدوں میں ان کی اِن کی پُر بہار تحریروں کے بے شمار موتی بکھرے پڑے ہیں جن سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور تخیلی قوت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے ہیں، اور ادیبوں کے سوانح بھی تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی، خواجہ امان (مصنف بوستانِ خیال)، انشاء اللہ خاں انشا، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، حکیم آغا جان عیش، انعام اللہ خاں یقینؔ پر تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری بھی کی ہے اور ''میری داستان'' نامی کتاب میں حیدر آباد کی اپنی ۳۴ سالہ زندگی کی روداد بھی بیان کی ہے لیکن ان کی اصل پہچان ''مزاح نگار کی صورت میں قائم ہوئی۔ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھنے میں ان کو مہارت حاصل تھی اور وہاں کا مخصوص روز مرّہ اور محاورہ وہ بڑی خوبی سے اپنی تحریروں میں برتتے تھے۔ ان کے اسلوب میں جو دلکشی اور لطافت ہے وہ اکتسابی نہیں

بلکہ فطری ہے اور اسی لیے وہ اردو کے مزاح نگاروں میں سب سے الگ اور منفرد نظر آتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے اصل باشندے اور طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے۔ وہ سابقہ ریاست حیدر آباد میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ مضمون نگاری کا شوق تھا اور پرانی داستانوں اور قصوں کو پھر سے زندہ کردینے کا ہنر ان کو خوب آتا تھا۔ ان کی زیادہ تر تحریریں، زمانۂ ماضی سے متعلق ہیں جن کو انھوں نے اپنے تخیل کی مدد سے زمانۂ حال میں لاکر اس طرح کھڑا کردیا ہے کہ عوام و خواص سبھی ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اپنے تہذیبی ورثے کی بازیافت کر سکتے ہیں۔ نذیر احمد کی کہانی 'پھول والوں کی سیر' اور 'دہلی کی آخری شمع' ان کی اسی قسم کی تحریریں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ کچھ اور نہ لکھتے تو صرف نذیر احمد کی کہانی ہی ان کو اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ ان کی قدردانی ان کے زمانے میں بھی خوب ہوئی اور دورِ حاضر میں بھی وہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار اور مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق ان کی ظرافت، ذہانت، آزادہ روی اور بے تکلفی کے بہت قائل تھے اور ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اردو زبان و ادب کا کوئی بھی تذکرہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے ذکر کے بغیر ادھورا ہی رہ جائے گا۔

حالاتِ زندگی

مرزا فرحت اللہ بیگ، ماہ ستمبر ۱۸۸۳ء میں پرانی دہلی کے محلہ چوڑی والان میں واقع مکان دلکشا منزل میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور دادا کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔ ان کا خاندان صدیوں سے دہلی میں آباد تھا، اس لیے مرزا فرحت بھی دہلی کے خاص باشندے تھے۔ مرزا فرحت کی والدہ، مشرف جہاں بیگم کا انتقال، مرزا کے لڑکپن میں ہی ہو گیا تھا، اس لیے ان کی پرورش ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے کی اور انھی کو وہ اپنی ماں سمجھتے تھے۔ مرزا کی نانی انجمن آراء بیگم، خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مصنف 'بوستانِ خیال' کی بیٹی تھیں۔ اس طرح خواجہ امان مرزا فرحت کے پرنانا تھے۔ ان کے والد مرزا حشمت اللہ بیگ ایک غیر ذمّے دار اور کچھ لاابالی قسم کے انسان تھے اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کا بار بھی ان کی پھوپھی ہی نے اٹھایا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد ان کو ایک قریبی مدرسے میں داخل کروا دیا گیا جہاں غلام یزدانی (جن کو وہ میاں دانی کہا کرتے تھے) بھی ان کے ہم جماعت تھے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ کشمیری دروازے کے اس مدرسے میں داخل ہوئے جس کی وسیع و عریض عمارت اور کھیل کے میدان میں ان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود کے بھی وافر مواقع ملے جس کے وہ شروع سے بہت شوقین تھے۔ یہ وہی عمارت تھی جو پہلے ریزیڈنسی کہلاتی تھی اور ۱۸۵۷ء سے قبل اس عمارت میں دلّی کالج بھی لگتا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ان کا داخلہ ہندو کالج میں ہوا جو اس وقت نیا نیا کھلا تھا اور کناری بازار کی ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ پایا اور یہیں سے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس

کے بعد مرزا فرحت ایم۔اے کی کلاسوں میں شامل ہوئے مگر امتحان نہیں دے سکے اور گھر کے حالات کے تحت ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ کچھ سعی و سفارش اور کچھ ذاتی قابلیت کی بنا پر ان کا نام ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کے لیے زیرِ غور تھا کہ ۱۹۰۷ء میں کچھ نجی ضرورتوں کے تحت وہ حیدر آباد چلے گئے اور گورنمنٹ اسکول چادر گھاٹ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے ان کی تقرری ہو گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کو ہائی کورٹ میں مترجمی کی اسامی مل گئی اور اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے وہ اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد گلبرگہ کے سشن جج اور آخر میں ہائی کورٹ کے انسپکٹنگ افسر مقرر ہوئے۔ یہ عہدہ ہائی کورٹ کے جج کے مساوی تھا۔

جب وہ گلبرگہ میں اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے تھے تو ان پر مذہبی رنگ کافی غالب آگیا تھا اور وہ نماز روزے کے پابند ہو گئے تھے حالانکہ اپنی جبلّت کے لحاظ سے وہ کھلنڈرے اور ہنس مکھ قسم کے انسان تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے حیدر آباد میں ایک ادبی تنظیم ’اردو مجلس‘‘ کے نام سے قائم کی تھی جس کے ممبران میں شہر کے تقریباً سبھی اہلِ علم اور سخن فہم حضرات شامل تھے۔ اس کی نشست بلاناغہ، ہر ماہ کے آخری جمعہ کے دن ہوتی تھی اور اس کا اہتمام مرزا فرحت اللہ بیگ خود کرتے تھے۔ مرزا فرحت کئی سال سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اردو مجلس کے ایک جلسے کے اختتام پر انھوں نے سجاد مرزا کو روکا اور کہا کہ اب آئندہ جلسے کا انتظام تم کو کرنا پڑے گا۔ سجاد مرزا نے اس ذمے داری کو پورا کرنے کی حامی بھر لی۔ ان کے رخصت ہونے کے محض تیس گھنٹوں کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ ۲۶ اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب تھی جب ان کا سفرِ زندگی تمام ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ حیدر آباد کے الٰہی چمن کے قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ بنی۔ مولوی مسعود علی محوؔی نے تاریخ وفات کہی جس سے عیسوی اور ہجری دونوں سنین برآمد ہوتے ہیں:

تھے فرحت بڑے پہلوانِ سخن ، زبانِ معانی تھے، جانِ سخن
جو وہ اٹھ گئے، اٹھ گئی ان کے ساتھ ، بہارِ زباں، عزّ و شانِ وطن
عنادل، خزاں آگئی باغ پر ، گیا، بلبلِ گلستانِ سخن

۱۹۴۷ عیسوی ، ۱۳۶۶ ہجری

مرزا فرحت اللہ بیگ بڑے باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ کھلنڈراپن، روشن خیالی، بیباکی اور وسیع النظری ان کے مزاج اور کردار کے خاص جوہر تھے۔ علم و ادب سے ان کی شناسائی کی ابتدا از مانۂ طالب علمی ہی سے ہو گئی تھی۔ کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ نیلام گھروں اور فٹ پاتھی کتب فروشوں سے ڈھیروں کتابیں خرید لاتے اور ان کو پڑھنے میں اتنے زیادہ ڈوب جاتے کہ اکثر کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے اور دوسرے ہاتھ میں کسی کتاب کا کھلا ہوا ورق یا ایک ہاتھ سے لقمہ توڑ کر کھا رہے ہیں اور آنکھوں سے کتاب کا مطالعہ بھی کرتے جا رہے ہیں۔ مطالعے میں انھیں تاریخ، شعراء کے دیوان اور تذکروں کا بڑا شوق تھا۔ مطالعے کے وقت اگر کوئی ان سے ملنے آ جاتا تو پریشان ہو جاتے اور کسی طرح اس کو نمٹا کر پھر پڑھنے میں جٹ جاتے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں کوئی دو ہزار کتابیں تھیں جن کے نام، نمبر اور مقام انھیں ازبر تھے۔ کوئی کتاب اپنی جگہ سے ہٹ جاتی تو ان کو فوراً پتہ چل جاتا کہ فلاں کتاب اپنی جگہ پر نہیں ہے اور وہ غل مچانے لگتے کہ کتاب کون لے گیا۔

طالب علمی کے زمانے سے مختلف قسم کے کھیلوں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور وہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ورزش کا بھی شوق تھا اس لیے بدن کسرتی اور مضبوط تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا اور خاندانی وجاہت چہرے مہرے سے ٹپکتی تھی۔ مشرقی طرزِ زندگی کے دلدادہ تھے۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر یا تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر لکھنا پڑھنا ان کو پسند تھا۔ سماجی دباؤ میں آ کر ایک عالی شان ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا جس کو قیمتی قالینوں اور عجائب و غرائب سے سجایا تھا۔ لیکن یہ عموماً بند ہی رہتا تھا۔ اس کے سامنے کے برآمدے میں دس بارہ معمولی قسم کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں اور خود ان کی بنائی ہوئی چند تصاویر دیوار پر آویزاں رہتی تھیں۔ اسی برآمدے میں وہ عام و خاص سب کا استقبال کرتے تھے، خاطر تواضع کرتے تھے اور اپنی لچھے دار اور پُر لطف گفتگو سے آنے والوں کو مسرور و محظوظ کرتے تھے۔ کوئی ان کی مصوری کی تعریف کر دیتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔

مرزا فرحت سماجی اعتبار سے ارسٹوکریٹ تھے مگر ان کے مزاج میں امیری کے بجائے درویشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کے لیے ان کا مہمان خانہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ضرورت مندوں کی روپے پیسے سے تو مدد کرتے ہی تھے، اگر

کسی نے ان کی شیروانی پہن لی یا کوئی اور کپڑا پہن لیا تو وہ اس کی جامہ زیبی کی تعریف کر کے اسی کو وہ اپنا کپڑا بخش دیتے تھے۔

ان کی پہلی بیوی محض چار سال کی ازدواجی زندگی کے بعد ہی چل بسیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ بہت دنوں تک وہ روزانہ ان کی قبر پر جاکر قرآن خوانی کرتے رہے اور بالکل بجھ سے گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر ان کے عزیزوں نے کسی طرح ان کو دوسری شادی پر تیار کر لیا۔ اس کے بعد ان کا جی بہل گیا اور وہ زوجہ ثانی کی بھی اسی طرح دلجوئی کرنے لگے جیسے پہلی بیوی کی کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں دو لڑکے، شرافت اللہ بیگ اور رفعت اللہ بیگ اور تین لڑکیاں تھیں۔

اپنی افتادِ طبع اور مزاج کے لحاظ سے وہ سیدھے سبھاؤ کے بے لوث انسان تھے۔ دنیاداری اور چالاکی سے وہ کوسوں دور تھے۔ تکلف اور نمائش کو بالکل ناپسند کرتے تھے۔ کھانے پینے اور پہننے میں بھی تکلف اور آرائش سے پرہیز تھا۔ علامہ اقبال کی طرح ان کو بھی مغربی لباس سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ کرتہ، پاجامہ اور شیروانی کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ ایک خاص موقع پر کئی عمدہ انگریزی سوٹ سلوائے اور ایک ہی دو مہینے میں اپنے عزیزوں کو بخش دئے حالانکہ اس زمانے کی ریاست حیدر آباد کا پورا ماحول اس کے بالکل برعکس تھا اور وہاں نمائش اور ظاہر داری کو بڑی فضیلت حاصل تھی۔ ان کے ایک کزن مرزا عصمت اللہ بیگ نے اس کا کچھ حال اس طرح بیان کیا ہے:

> "حیدر آباد کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہاوت ہے "حیدر آباد نگینہ، نیچے مٹی اوپر چونا" یہاں کا طرزِ تمدن اور تہذیب و معاشرت، ہندوستان سے بالکل جدا ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ ایسی کہ آپ دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ موٹر بھی ہے۔ شوفر بھی ہے۔ شوفر کا ڈریس بھی ہے۔ کپڑے بھی ٹیپ ٹاپ کے ہیں۔ ڈرائنگ روم بھی فرسٹ کلاس ہے۔ عہدے داروں سے ملنے جاؤ تو گھنٹوں دروازے پر لٹکے رہو۔ یار لوگ ان سے ملتے ہیں تو سر خم کر کے فرشی سلام جھاڑتے ہوئے رکوع میں چلے جاتے ہیں۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بھی جی سرکار، جی سرکار اور بجا ہے سرکار، کرتے رہتے ہیں۔ اس کے سوا دوسری بات زبان سے نہیں نکالتے۔ مرزا صاحب بھلا ان باتوں کو کہاں

ماننے والے تھے۔ دور ہی سے آداب عرض کا پتھر کھینچ مارتے تھے۔"

کچھ خاندانی وراثت اور کچھ فطری دلچسپی کے باعث، مرزا فرحت کو بڑی بوڑھیوں سے پرانے تاریخی واقعات سننے کا بڑا شوق تھا۔ خواجہ امان، مصنف بوستانِ خیال، ان کے پرنانا تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ رات میں ان کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور وہ ان کو عیاری سے بھری طلسماتی داستانیں سناتے تھے۔ دن میں انھی داستانوں کو وہ کاغذ پر اتار لیتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بوستانِ خیال کی سات جلدیں تیا ہو گئیں۔ اپنی آخری عمر میں مرزا غالبؔ بھی ان داستانوں کو بڑی دلچسپی اور چاؤ سے پڑھتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ان داستانوں کو سنتے سنتے خود بھی داستان گو بن گئے اور راتوں میں دیر دیر تک لمبی لمبی خیالی داستانیں سنانے لگے۔ ان کی داستانیں اتنی دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتی تھیں کہ لوگ دن میں سوتے تھے اور رات میں بارہ بارہ بجے تک اور اکثر اس کے بعد بھی مرزا فرحت سے داستانیں سنتے تھے۔ حد یہ ہے کہ ان کا ایک ملازم جس کا نام مونگا تھا، ان کا پیر دباتے دباتے اور چلمیں بھرتے بھرتے، ان کی داستانیں سن سن کر خود بھی داستان گو بن گیا اور اس نے ایسے پر پُرزے نکالے کہ مونگا سے محمد حسین بن گیا۔ لوگ اس کو گاڑی بھیج کر اپنے یہاں بلاتے اور اس سے داستانیں سنتے۔ وہ مرزا فرحت کے کپڑے اور سامان بھی استعمال کرنے لگا اور مرزا فرحت تھے کہ بجائے ناخوش ہونے یا اس کی سرزنش کرنے کے، اس سے اور زیادہ محبت کرنے لگے، یہاں تک کہ جب اپنا مکان بنایا تو اس میں ایک کمرہ مونگا کے لیے مخصوص کر دیا۔

اس داستان سرائی کی بدولت مرزا کی تخئیلی قوت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا اور وہ ان مناظر کو بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان کرنے لگے جن کو انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ مرزا عصمت اللہ بیگ بیان کرتے ہیں:

> "ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے اپنی سیر و سیاحت کا ذکر چھیڑا۔ جوگ فال کی بڑی تعریف کی۔ آبشار کے کئی رخ بتائے۔ ایک تصویر دکھائی جو خود انھوں نے کھینچی تھی۔ بھائی فرحت کب ماننے والے تھے۔ کہنے لگے جناب! آپ نے زاویے تو اتنے بنائے مگر تصویر غلط زاویے سے لی۔ اگر آپ اسے بجائے بمبئی بنگلے کے، میسور بنگلے سے لیتے تو راجہ فال،

روور، راکٹ اور ڈیم پلاش، چاروں کے چاروں صاف گرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ پھر شموگا کی گھاٹیوں اور آبشاروں کے مناظر کی ایک دلچسپ تصویر کھینچی، بلندی بتائی، اس کا مقابلہ دوسرے آبشاروں سے کیا، آروے اور نیاگرہ فال کا ذکر کیا، جسے سن کر سیاح صاحب پانی پانی ہوگئے اور لطف یہ کہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا کہ واقعی وہ میسور بنگلے نہ جاسکے اور یہ ارمان ان کے دل ہی میں رہ گیا۔ جب وہ گردن جھکا کر چل دیے تو میں نے بھائی فرحت سے پوچھا کہ بھائی! آپ ہرسپا دیکھنے کب گئے تھے؟ کہنے لگے، میاں، گیا کون تھا! میسور گائڈ میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ گپیں لگا رہا ہے تو میں نے بھی ایک گپ لگادی۔''

اصلیت یہ ہے کہ جس طرح کی گپیں مرزا فرحت ہانکتے تھے، اس میں ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ ساتھ علمِ حاضر بھی ضروری تھا۔ اوپر بیان کیے ہوئے واقعے میں اگر میسور گائڈ میں لکھی ہوئی باتیں، ان کے ذہن میں تازہ نہ ہوتیں تو وہ آبشاروں کے مناظر اس خوبی سے بیان نہیں کر سکتے تھے کہ اصل سیاح شش وپنج میں پڑ جاتا۔

مرزا فرحت کو تصویری خاکوں میں اپنے تخیل کی مدد سے رنگ بھرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا، اسی کی مدد سے انھوں نے چند تذکرے پڑھ کر، ایک خاص دور کے اردو شاعروں کے احوال اور ان کے کلام تک رسائی حاصل کی اور اپنے بے مثل تخیل کی مدد سے ایک جیتا جاگتا مشاعرہ برپا کردیا جس کا نام دہلی کی آخری شمع یادہلی کا ایک یادگار مشاعرہ ہے۔

ایک مرتبہ ان کے کچھ عزیز یورپ کے سفر کو گئے۔ واپسی میں سفر کے حالات کے ساتھ ساتھ، وہاں کے عجائب و غرائب کا بھی ذکر کیا۔ مرزا فرحت کچھ دیر تک سنتے رہے، پھر بولے۔ آپ نے بیکار اتنا روپیہ صرف کیا۔ جو عجیب و غریب باتیں آپ نے دیکھیں ان سے زیادہ دلچسپ باتیں اور عجائب تو میں یہاں بیٹھے بیٹھے آپ کو سنا سکتا ہوں۔ دوسرے ہی دن انھوں نے ایک خیالی سفر نامہ لکھ ڈالا جس کا نام انھوں نے ''بوریو کا سفر نامہ'' رکھا اور اسے شائع بھی کروایا۔ حقیقت میں ان کے یہ خیالی عجائب، یورپ کے اصل عجائب سے بھی زیادہ دلچسپ اور لطف آمیز ہیں۔ ایک موقع پر پہلوانوں کی ایک کشتی کا آنکھوں دیکھا حال، اس کی تمام جزئیات اور عملی داؤ پیچ کے ساتھ بیان کر کے، سننے والوں کو

متحیر کر دیا جبکہ انھوں نے واقعتاً یہ کشتی کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے داستان سننے سے لے کر داستان سرائی اور داستان طرازی کی سب منزلیں بڑی آسانی سے سر کر لی تھیں اور اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں معمولی سے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر ایک بڑا واقعہ بنا دینے میں ان کو مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ ماضی قریب کے تاریخی واقعات کو کچھ پڑھ کر اور سن کر اور زیادہ تر اپنے تخیل کی مدد سے انھوں نے زندہ کر دیا ہے جس کا ایک نمونہ ان کا شاہکار مضمون "پھول والوں کی سیر" ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ خاص دہلی کے باشندے تھے اور دہلی ان کے دل میں بسی تھی۔ وہ محض ۲۴ سال کی عمر میں دہلی چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے تھے اور وہاں انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کے چالیس سال بسر کیے لیکن ذہنی طور پر انھوں نے اپنی ساری عمر دہلی ہی میں گزاری۔ حیدر آباد میں تمام کامرانیوں اور دنیاوی آسائشوں کے باوجود وہ یہاں کی ملازمت اور بسر اوقات کو ۳۴ سالہ قیدِ بامشقت سے تعبیر کرتے تھے۔ "میری داستان" میں انھوں نے جو حالات بیان کیے ہیں، اس سے ان کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حیدر آباد پہنچنے کے بعد انھوں نے مولوی عزیز مرزا سے ملاقات کی جو اس وقت وہاں کے ہوم سکریٹری تھے اور رشتے میں ان کے خالو ہوتے تھے۔ مولوی عزیز مرزا نے ان کو حیدر آباد میں ملازمت کی پیش کش کی، جس پر مرزا فرحت نے جواب دیا "میرا نام ڈپٹی کلکٹری کے لیے گیا ہوا ہے۔ ایسی خدمت (ملازمت) یہاں ملنی مشکل ہے۔" اس پر انھوں نے کہا "کیوں مشکل ہے۔ ہم سب مل کر اس سے کہیں اچھی خدمت تم کو دلوا سکتے ہیں۔" میں تو خاموش ہو گیا مگر والد صاحب کو مجھے حیدر آباد میں روکنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے کہا "ہاں! آپ اس کو یہیں لگا لیجئے۔ اگر ہندوستان میں رہا تو ہم لوگوں کا اس سے ملنا مشکل ہو گا۔" یہ پہلا موقع تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کی اصطلاح میں حیدر آباد، ہندوستان سے خارج ہے اور ہندوستان کے مفہوم اور معنی میں صرف شمالی ہند داخل ہے۔"

ملازمت کے اس ابتدائی مرحلے سے حیدر آباد کی اندرونی گروہ بندیوں، رقابتوں، چپقلشوں اور ریشہ دوانیوں کی پرتیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں جن کا سلسلہ آخر تک قائم رہتا ہے۔

وہاں کی عدالتِ عالیہ کے میر مجلس (چیف جسٹس) نواب سربلند جنگ کو مرزا

فرحت کی چچازاد بہن منسوب تھیں مگر پہلی ہی ملاقات میں ان کی تقریر سے مرزا فرحت کی ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ سر بلند جنگ نے مرزا فرحت سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"میاں فرحت! تم حیدر آباد کی نوکری کے جھگڑوں میں نہ پڑو۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔ میں افسر جنگ بہادر کو کہہ کر "فلک نما" اور "گولکنڈہ" کے پاس منگوائے دیتا ہوں۔ انھیں جا کر دیکھ لو۔ حسین ساگر کے کٹھ کی سیر کرو، شہر کی عمارتیں دیکھو اور دہلی واپس چلے جاؤ۔ اگر یہاں رہنے کا ارداہ کیا تو یاد رکھنا کہ تمھاری زندگی برباد ہو جائے گی اور جینا حرام ہو جائے گا۔"

سر بلند جنگ کا یہ مشورہ بالکل ہی بے معنی نہ تھا۔ اپنی ملازمت کے بارے میں مرزا فرحت نے آگے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ریاست حیدر آباد میں منافقت اور ریشہ دوانی نہ صرف اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی بلکہ یہ ایک آرٹ بن گئی تھی۔ اربابِ اقتدار ایسے ایسے حیلوں بہانوں سے اپنے مخالفین کو زک پہنچانے یا ان کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ شرافت اور انسانیت اس سے پناہ مانگتی تھی۔ ایسی ایسی شاطرانہ چالیں چلتے تھے کہ کبھی کبھی وزیر اعظم تک کو مات کھانا پڑتی تھی اور یہ پھر بھی سرخرو رہتے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے جو یہ سب جھیل لے گئے اور مخالفین و موافقین دونوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے مولوی خدا بخش کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس سے وہاں کی اندرونی سیاست کا نقشہ بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ مولوی خدا بخش پٹنہ سے آئے تھے اور حیدر آباد میں درجہ اول کی وکالت کی سند چاہتے تھے۔ وہ سید علی بلگرامی (مولف تمدنِ ہند اور تمدنِ عرب) کے یہاں ٹھہرے تھے جنھوں نے ان کی سفارش مولوی افضل حسین، میر مجلس عدالتِ عالیہ سے کر دی کہ ان کو درجہ اول کی وکالت کی سند دلوا دیجئے۔ مولوی افضل حسین نے ان کی اردو کی زبان دانی کا ٹیسٹ کروایا تو وہ صحیح جوابات نہ دے سکے، اس لیے ان کی درخواست نامنظور ہو گئی۔ واپس آکر جب یہ بات انھوں نے مولوی سید علی بلگرامی کو بتائی تو ان کو اپنی توہین محسوس ہوئی اور ان کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔ یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ ہے اور یہ بات مرزا فرحت کو ان کے واقف کاروں نے بتائی

تھی۔ اس زمانے میں نواب سرور الملک کا بڑا زور تھا کیونکہ وہ نظام حیدر آباد کی پیشی میں رہتے تھے اور نظام ان کا بڑا اعتبار کرتے تھے۔ سرور الملک، مولوی سید علی بلگرامی کے گہرے دوست تھے اور ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے مولوی خدا بخش کا واقعہ نمک مرچ لگا کر نواب سرور الملک کو سنایا۔ انھوں نے بظاہر ان کو تسلّی دی اور خدا بخش خاں سے تین روز بعد بیچ محلّہ میں ملنے کو کہا۔ جب مقررہ دن وہ وہاں پہنچے اور اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو نواب سرور الملک نے ان کو ایک بند لفافہ دے کر کہا کہ آج عدالتِ عالیہ کا جلسۂ انتظامی ہے۔ جب سارے جج صاحبان آجائیں تو مولوی افضل حسین کو اطلاع کرا دینا کہ تم نواب سرور الملک کا خط لے کر آئے ہو اور خود ان کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہو۔ مولوی خدا بخش نے ایسا ہی کیا اور مہر بند لفافہ لے جا کر مولوی افضل حسین کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے خط پڑھا، اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ''آیئے تشریف رکھیے'' وہاں موجود سبھی جج صاحبان سے کہا'' صاحبو! یہ خط نہیں، فرمانِ مبارک ہے۔ اس میں حکم ہے کہ خدمتِ میر مجلسی کا جائزہ اسی وقت خدا بخش خاں صاحب کو دے دیا جائے۔ جن صاحب کو درجہ اول کی وکالت کی سند نہیں مل سکی تھی، ان کو ایک ہی جھٹکے میں عدالتِ عالیہ کی میر مجلسی مل گئی۔[1] اس زمانے کی دیسی ریاستوں میں ہر جگہ یہی سب کچھ ہوتا تھا اور حیدر آباد بھی اس سے اچھوتا نہ تھا۔ برٹش حکومت ان سب باتوں کو بخوبی جانتی تھی مگر اپنی مصلحتوں کے تحت وہ مداخلت نہیں کرتی تھی اور اندرونی معاملات پورے طور سے راجاؤں اور نوابوں کی مرضی پر چھوڑ دیتی تھی۔ اس میں اس کا فائدہ یہ تھا کہ وہ ان ریاستوں کی اندرونی سرکشی سے محفوظ رہتی تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بہت ہوشمند اور زمانے کی چالوں کو سمجھنے والے انسان تھے، اس لیے وہ اس غیر یقینی اور غیر محفوظ ماحول میں بھی عزت سے اپنی زندگی نباہ لے گئے اور اسی سرزمین میں آخری سانس لی اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

---

[1] یہ وہی مولوی خدا بخش ہیں جنھوں نے حیدر آباد کی تین سال کی ملازمت کے بعد پٹنہ واپس آکر ایک لائبریری قائم کی جو اب ''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری'' کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔

زمانہ اور ماحول

مرزا فرحت اللہ بیگ کو اپنی کارگزاریوں کے لیے جو زمانہ ملا، وہ آزادی سے قبل کی نصف صدی کا زمانہ تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں سارے ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا تھا اور ایک طرح سے یہاں کے لوگ اس کے عادی ہو گئے تھے۔ آبادی کم تھی، اس لیے مسائل بھی کم تھے مگر مفلسی، بیروزگاری، جہالت اور توہمات کا دور دورہ تھا۔ آزادی حاصل کرنے کی چنگاری دبی نہیں تھی بلکہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء) کے بعد یہ دبی ہوئی چنگاری، شعلہ بننے کے لیے بیتاب ہو گئی۔ مہاتما گاندھی جب جنوبی افریقہ سے واپس ہندوستان آگئے اور یہاں کے عوام کی بدحالی اور کسمپرسی کو اپنی آنکھوں سے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا تو وہ خاموش نہ رہ سکے اور انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف زوردار سنگھرش چھیڑ دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس اگرچہ ۱۸۸۹ء میں قائم ہو چکی تھی لیکن یہ دولت مند تاجروں اور امیروں کے زیرِ سایہ محض ایک سیاسی کلب بن کر رہ گئی تھی جس کا مقصد انگریزوں کی خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گاندھی جی نے جب اس کی قیادت سنبھالی تو اس میں ایک نئی جان پڑ گئی اور اس نے ہندوستان کی آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ہندوستان کے عوام شاید اس کے منتظر تھے اور گاندھی جی کے میدان میں آنے کے بعد سارے ملک میں جگہ جگہ کانگریس کے پرچم تلے عوامی مظاہروں اور جلسے جلوسوں کا بازار گرم ہو گیا اور پورے ہندوستان میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ پہلے دَور میں کانگریس اور مسلم لیگ ساتھ ساتھ رہ کر آزادی کے لیے

جدو جہد کرتے رہے لیکن کچھ عرصے بعد مسلم لیگ نے کانگریس سے اپنا ناتہ توڑ لیا اور اپنی علاحدہ لیڈر شپ قائم کر کے مسلمانوں کی پوری نمائندگی کا دعویٰ کیا جس کا آخری انجام تقسیمِ ملک کی صورت میں سامنے آیا۔

دوسری طرف انگریزوں کی سرپرستی میں قائم، کئی سو چھوٹی بڑی دیسی ریاستوں کی صورتِ حال، برٹش انڈیا سے کافی حد تک مختلف تھی۔ حیدر آباد، میسور، بھوپال، پٹیالہ جیسی بڑی دیسی ریاستوں میں زندگی نسبتاً پُر سکون تھی اور حصولِ آزادی کے لیے وہ ہلچل نہیں تھی جو برٹش انڈیا میں تھی۔ اس زمانے میں نظام حیدر آباد کی ریاست، سارے ملک میں سب سے بڑی دیسی ریاست تھی، جہاں کا سارا نظام مثلاً کرنسی، ریل، عدالت، سِول سروس، تعلیم سب پوری طرح نظام کی حکومت کے تابع تھے اور ایک طرح سے حکومت کے اندر حکومت قائم تھی۔ وہاں ایک انگریز ریزیڈنٹ ضرور رہتا تھا جو صرف یہ دیکھتا تھا کہ کہیں انگریزی حکومت کے خلاف کوئی شورش تو سر نہیں اٹھا رہی ہے یا کسی علاقے سے انگریزوں کے مفاد پر چوٹ تو نہیں پڑ رہی ہے۔

چونکہ ریاست حیدر آباد کے حالات میں ٹھہراؤ تھا اور وہاں ملازمت اور ترقی کے مواقع بھی موجود تھے، اس لیے برطانوی ہندوستان سے اکثر لوگ، خاص کر اردو و فارسی زبانوں کے قابل و فاضل لوگ، ادیب و شاعر وقتاً فوقتاً حیدر آباد پہنچتے رہتے تھے۔ بعض لوگوں کی ان کی شہرت اور قابلیت کی بنا پر نظام خود بلاتے تھے اور ان کو اچھی اور دلکش ملازمتوں سے نوازتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بہتر اور لازمی پنشن سہولتوں کے مدِ نظر بھی لوگ حیدر آباد کی ملازمتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ ریاست کے وزیر اعظم، مہاراجہ سر کشن پرشاد خود بھی بہت علم دوست، اردو کے شیدائی اور خوش فکر شاعر تھے۔ وہ اہلِ علم کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کو ہر ممکن سہولت پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

حیدر آباد کی سرکاری زبان اردو تھی اور عدالت و انتظامیہ کا سارا کام اسی زبان میں ہوتا تھا، چنانچہ اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے تک کے سارے مضامین، چاہے وہ سائنس ہو یا فلسفہ یا انجینئرنگ، اردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے اور اسی زبان میں سارے امتحانات ہوتے تھے۔ سائنس و فلسفہ اور دیگر علوم کی کتابیں اردو میں منتقل کرنے کے لیے حیدر آباد میں ایک دارالترجمہ بھی قائم تھا جہاں ترجمے کے ساتھ

ساتھ اصطلاح سازی کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی، مولوی وحید الدین سلیم اور جوش ملیح آبادی کے علاوہ بھی بہت سے ماہرین اور اعلیٰ قابلیت رکھنے والے اردو داں، دار الترجمہ سے متعلق تھے۔ عدالتوں کا سارا کام کاج اردو ہی میں ہوتا تھا مگر فیصلے انگریزی میں بھی لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ جب مرزا فرحت اللہ بیگ پہلی مرتبہ حیدر آباد پہنچے تو ان کو عدالتِ عالیہ میں مترجمی کی جگہ ملی۔ اس سے ترقی کرتے کرتے آخر میں وہ عدالتِ عالیہ کے جج کے مساوی عہدے پر پہنچے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حیدر آباد میں سب کچھ اچھا ہی اچھا تھا۔ وہاں بھی جوڑ توڑ، سازش اور چپقلش کا بازار گرم تھا۔ ملکی اور غیر ملکی کا تنازعہ بھی اچھلتا رہتا تھا۔ حیدر آباد کے مقامی باشندے، برطانوی ہندوستان سے وہاں آئے ہوئے لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ طرزِ معاشرت میں نمائش اور دکھاوے کا بول بالا تھا۔ حیدر آباد شہر نوابوں، تعلقے داروں، رئیسوں اور اعلیٰ افسروں کا گڑھ تھا، اس لیے وہاں امارت کی نمائش بھی سب سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ درباری آداب و رسوم بھی بعض لوگوں پر گراں گزرتے تھے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دنیاوی آرام و آسائش اور پُر امن ماحول کے باوجود، وہاں ایک قسم کی گھٹن پائی جاتی تھی جو آزاد مشرب لوگوں کے مزاج اور افتادِ طبع کے خلاف پڑتی تھی اور کبھی کبھار اس کا علانیہ مظاہرہ بھی ہو جاتا تھا۔

حیدر آباد کے باغیوں میں شاید پہلا نمبر جوش ملیح آبادی کا ہے جنھوں نے وہاں کی ملازمت میں رہتے ہوئے بھی نظام کے خلاف نظم لکھی اور اس کو اخبار میں چھپوا بھی دیا جس کا انجام یہ ہوا کہ ان کو فوری طور سے حیدر آباد بدر کر دیا گیا لیکن اس بغاوت کے باوجود ان کی پنشن بند نہیں ہوئی اور وہ ان کو لکھنؤ واپس آنے کے بعد بھی ملتی رہی۔

اس میں شک نہیں کہ ریاست حیدر آباد میں اہلِ علم و دانش کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ کچھ اصحاب شمالی ہند سے وہاں آتے جاتے رہتے تھے اور کچھ اصحاب نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، کیونکہ وہاں ان کو بڑی بڑی مراعات اور سہولتیں حاصل تھیں۔ دوسرے زمرے کے اکابرین میں داغ دہلوی، امیر مینائی، مولوی نذیر احمد، جلیل مانکپوری، مولوی وحید الدین سلیم، سید علی بلگرامی، مولوی عنایت اللہ، نظم طباطبائی، مرزا حیرت بدایونی، صدق جائسی، فانی بدایونی، محشر بدایونی، مولوی عبد الحق اور مولانا گرامی وغیرہم

شامل ہیں۔ گاہ گاہ آنے جانے والوں میں علامہ اقبال، سر راس مسعود، خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے مشاہیر تھے۔ یہ واقعہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے ایک موقع پر علامہ اقبال کو بطور امداد ایک ہزار روپے عنایت کیے تھے مگر چونکہ یہ رقم، نظام کے توشہ خانے سے دی گئی تھی، اس لیے اقبال نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ایک طنزیہ قطعہ لکھ کر مہاراجہ کو بھیج دیا جس کا آخری شعر یہ ہے

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

بیشک اس پورے دَور میں یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک حیدر آباد، علم و ادب کا گھوارہ بن گیا تھا اور اردو کی ترقی کے لیے ایک بے حد ساز گار اور حوصلہ بخش ماحول تیار ہو گیا تھا لیکن اس کا ایک دوسرا رخ بھی تھا جس کا کچھ اندازہ اس خط کے ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو سید محمد قادری نے ۱۹۲۹ء میں سید محی الدین قادری زور کو لکھا تھا جو اس وقت لندن میں فروکش تھے:

> "حیدر آباد اگرچہ ترقی پذیر ہے لیکن رفتارِ ترقی بہت ست ہے۔ تھوڑے سے آدمی جو لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں، ان میں آپس میں نفاق، دلی عداوت اس قدر زیادہ ہے کہ اجتماعی طور پر کسی کام کا ہونا تو کجا، ان کا کسی ایک مجلس میں مل کر بیٹھنا اور ہنسنا بولنا بھی مشکل ہے۔ میں ان حالات سے بہت دل گرفتہ رہتا ہوں۔ ملک کی بدقسمتی ہے کہ جو لوگ بڑی بڑی تنخواہیں پانے لگے ہیں اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں، وہ کبھی دوسرے اہلِ ادب کی قدر کرنے اور ان کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں۔ ہر وقت ان سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔"

(بحوالہ ماہنامہ سب رس۔ حیدر آباد۔ جنوری ۲۰۰۰ء)

اس ریاست کے عوام و خواص دونوں ہی ہندوستان کی عام سیاسی فضا سے الگ تھلگ تھے۔ ان کے لیے نظام کی ریاست ہی سب کچھ تھی۔ ملک کے سیاسی حالات کی خبریں تو وہاں تک پہنچتی ہی تھیں لیکن بظاہر ان کو اپنا گوشۂ عافیت زیادہ محفوظ معلوم ہوتا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی بقیہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے تھے اور اپنی روزمرہ کی

زندگی کے معمولات ہی میں مگن رہتے تھے۔ یوں بھی ان کا تعلق حیدر آباد کے عدالتی نظام سے تھا، اس لیے ان کا سیاسی تحریکوں سے فاصلہ بنائے رکھنا فطری تھا۔ ان کی تحریروں سے بھی کسی قسم کے سیاسی جھکاؤ کا اندازہ نہیں ہوتا۔

نظام حیدر آباد کی ریاست، دیسی ریاستوں میں سب سے بڑی تھی اور اس کو خصوصی درجہ حاصل تھا۔ دنیاوی عیش و عشرت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ آپسی کاٹ پیچ بھی وہاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھی جس کا تفصیلی تذکرہ مرزا فرحت نے ''میری داستان'' میں کیا ہے۔ عیش و عشرت کی فراوانی کے دلچسپ قصے صدق جائسی (مرحوم) نے اپنی کتاب ''دربارِ دُربار'' میں مزے لے لے کر بیان کیے ہیں۔ مسلم ریاست ہونے کی وجہ سے وہاں مذہبیت بھی کم نہیں تھی جس کے مظاہر نجی اور عوامی زندگی، دونوں میں دیکھے جا سکتے تھے، مرزا فرحت اللہ بیگ کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی ذاتی صلاحیت، معاملہ فہمی اور ہوش مندی کے سبب، ناموافق حالات میں بھی نباہ کرنا جانتے تھے اور تمام مصروفیتوں کے باوجود اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے میں مستعد رہتے تھے۔ انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں مزاحیہ، نیم سنجیدہ اور سنجیدہ مضامین لکھے جو مضامینِ فرحت کی سات جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں ''میری داستان'' اور ''میری شاعری'' بھی چھپ چکی ہیں، البتہ پہلی کتاب، ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد ۱۹۷۷ء میں ان کے فرزند مرزا شرافت اللہ بیگ نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں ضمناً انھوں نے موسیٰ ندی کی اس قیامت خیز طغیانی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کو رونما ہوئی تھی اور حیدر آباد شہر کو بڑے پیمانے پر تباہ کر گئی تھی۔ مرزا فرحت کا بیان ہے کہ:

> اس ندی کے کنارے کا کوئی محلّہ ایسا نہ تھا جو اس سرے سے اس سرے تک صاف نہ ہو گیا ہو، اور کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس میں کم سے کم چار آدمی نہ بہہ گئے ہوں۔ اب رہا مال و اسباب تو بھلا وہ کیا بچتا۔ گھانس کے بازار اور بیگم بازار کی طرف پانی اس طرح ایک ہی دفعہ ٹوٹا تھا کہ کسی کو گھر سے نکلنے کی مہلت تک نہیں ملی اور سب یونہی، مال و اسباب چھوڑ کر، ایک جوڑے کپڑے سے نکلے تھے۔ ان میں سے کچھ بہہ گئے تھے، کچھ رہ گئے تھے۔ غرض جو لکھ پتی تھے وہ تھوڑی دیر میں غریبوں سے بدتر ہو گئے، کچھ لوگ

درختوں پر چڑھ گئے تھے، ان تک کشتیوں میں بیٹھ کر فوج والے گئے اور ان کو وہاں سے اتار کر لائے۔ کچھ لوگ دو منزلوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے، ان کو سیڑھیاں لگا لگا کر اتارا گیا۔۔۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ندی پایاب ہو گئی۔ اس وقت ہم سب مل کر شہر کے اندر گئے۔ وہاں جو حالت دیکھی وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔"

موسیٰ ندی کا یہ طوفان مرزا فرحت اللہ بیگ کے حیدر آباد پہنچنے کے ایک سال بعد ہی آگیا تھا۔ اس طوفان سے ایک ماہ قبل ان کی شادی بھی گلبرگہ کے ایک خوش حال خاندان میں ہو چکی تھی۔ اسی دوران ممالک متحدہ آگرہ اودھ (موجودہ اتر پردیش) میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر ان کو نامزدگی کی اطلاع ملی مگر انھوں نے اس آفر کو قبول نہیں کیا اور معذرت کا خط لکھ کر بھیج دیا "لیکن جب حیدر آباد کی حالت، یہاں کی کشمکش اور آپس کی مخالفت دیکھی، اس وقت آنکھیں کھلیں اور افسوس ہوا کہ ناحق ایسی اچھی خدمت پر لات ماری۔ آج اگر وہاں ہوتا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہوتا لیکن بعد میں وہاں کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور یہاں اپنی ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اچھا کیا۔"

فرحت اللہ بیگ نے دہلی میں جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور تعلیم حاصل کی تھی، وہ ایک جداگانہ ماحول تھا اور ریاست حیدر آباد میں جو زندگی بسر کی وہ ایک دیگر ماحول کی زندگی تھی جس میں آرام و آسائش تو بہت تھی لیکن ارد گرد کی سازشوں سے نمٹنے کے لیے، چول پر چول بٹھانا آسان نہ تھا تاہم انھوں نے اس شخصی حکومت کے ماحول میں بھی خود کو لیے دیے رکھا اور اپنی محنت، لگن، فرض شناسی اور ماحول کی نبض شناسی کے سبب برابر ترقی کرتے رہے اور عزت و حرمت سے زندگی گزاری۔ ذہنی طور سے وہ حیدر آباد میں رہتے ہوئے بھی "دہلی والے" ہی رہے اور ہمیشہ دہلی ہی کو یاد کرتے رہے۔ دہلی سے ان کے جذباتی لگاؤ کا سبب ڈھونڈھنا مشکل نہیں ہے۔ دہلی محض ایک شہر نہیں تھا بلکہ ایک تہذیب اور کلچر کا نام تھا جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے رگ و ریشے میں بسا ہوا تھا۔ اس کلچر کا کچھ اندازہ ان کے ایک مضمون "نئی دہلی" سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے ایک فرضی کردار مرزا قمر الدین کی زبانی، اس صدی کے اوائل کی دہلی کا حال بیان کیا ہے جس کے خدوخال اب موجودہ دہلی میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ مرزا قمر الدین نے ایک عام آدمی کی سطح پر

دہلی کو جس طرح دیکھا اور پایا تھا، اب وہ اس کے محض نوحہ گر بن کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون کے آخری پیراگراف میں مرزا فرحت نے خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ دہلی اپنا نیا چولا بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے:

> دوسرے دن میں حیدر آباد چلا آیا۔ سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا۔ جو خوشی دلّی جا کر ہوئی تھی وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی۔ یہ تو میں بھی کہوں گا کہ دلّی مجھ کو بھی نئی نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دلّی رکھا گیا۔ جو دلّی ہمارے زمانے میں تھی وہ تو اب نہیں رہی، اب چاہے دلّی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں۔"

مزاح نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ کی عام شہرت اگرچہ بحیثیت مزاح نگار قائم ہوئی لیکن ان کا پورا ادبی سروکار اس طرح طنز و مزاح سے نہ تھا جس طرح ان کے دیگر ہم عصروں مثلاً رشید احمد صدیقی، پطرس، شوکت تھانوی یا عظیم بیگ چغتائی کا تھا۔ ان کی مزاح نگاری دراصل ان کی خوش طبعی، زندہ دلی، خوش مذاقی اور بذلہ سنجی کی دین تھی۔ انھوں نے ظریفانہ انشائیے لکھنے پر تکیہ نہیں کیا بلکہ فرضی یا اصلی واقعات پر جو مضامین لکھے، ان میں ظرافت اور خوش دلی کے عناصر اس طرح شامل کر دیے کہ مضمون میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ ان کے طرحدار اسلوب کے خاص عناصر دہلی کی ٹکسالی زبان، روزمرہ اور محاورہ کا برجستہ استعمال، ضرب الامثال کا چٹکیلا پن، طرزِ ادا کا سبج سبھاؤ اور داستانی اندازِ بیان ہیں۔ انھیں سے وہ اپنی عبارت کو سجاتے سنوارتے ہیں اور انھیں سے بیان کا لطف پیدا کرتے ہیں۔ ان کے طرزِ بیان میں آمد ہی آمد ہے اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سوچ کر فقرے ڈھال رہے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے زیادہ تر مضامین، ان کی ہمعصر زندگی یا ماضیِ قریب کے واقعات پر مبنی ہیں جن میں وہ اپنے مزاحیہ اسلوب سے داستانوں کی سی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ نذیر احمد کی کہانی ہو یا مولوی وحید الدین سلیم کا خاکہ، جزیرہ بورنیو کا سفر نامہ ہو یا ایک نواب صاحب کی ڈائری کے پراگندہ صفحات، یا پھر حصولِ ملازمت کے لیے نواب صاحب لوہارو اور یوپی کے انگریز گورنر سے ملاقات کا ڈرامہ، یہ سب ان کے طرزِ بیان کی شوخی اور ان کی فطری خوش طبعی اور بذلہ سنجی کی ہی شہادت دیتے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے، اپنے بے مثل اور زرخیز

تخیل کی مدد سے ذہن میں ایک نگار خانہ سجا لیتے تھے اور پھر اس کو کاغذ پر اس طرح منتقل کر دیتے تھے کہ اپنی ساری جزئیات کے ساتھ فرضی واقعہ بھی اصلی نظر آنے لگتا تھا اور پڑھنے والا ان کے طرزِ ادا کی سحر کاری میں کھو جاتا تھا۔ مرزا فرحت کا خاص کانامہ ماضی کی بازیافت ہے۔ مغلیہ دور کی تاریخ و تہذیب کو انھوں نے اپنے ظرافت آمیز اسلوب میں گوندھ کر اس کو نئے زمانے کے لیے بھی دلچسپ اور پُر کشش بنا دیا ہے۔ ''پھول والوں کی سیر'' اور ''دہلی کی آخری شمع'' میں انھوں نے نہ صرف ایک خاص دَور کی تہذیبی تاریخ کو زندہ اور محفوظ کر دیا ہے بلکہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی تہذیبی وراثت پر فخر اور اطمینان کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اپنی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' میں لکھتے ہیں:

''وہ بیشتر اوقات، گزرے ہوئے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں، شاید اس مقصد کے ساتھ کہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے یہ نمونے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد بڑا سنجیدہ ہے اور اگر اس میں احتیاط نہ برتی جائے تو ادبی مضامین کا محض تاریخی مضامین ہو کر رہ جانا عین ممکن ہے۔ ایسے میں فرحت اللہ بیگ ایک فطری شگفتگی اور ظرافت سے ان واقعات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور انھیں اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی تاریخی ثقالت ہی ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ ہمدردانہ نقطہ نظر بھی ابھر آتا ہے جو اعلیٰ ظرافت کے لیے از بس ضروری ہے۔''

اپنی ہمعصر زندگی کے بارے میں بھی ان کے مشاہدات کچھ کم توجہ طلب نہیں ہیں۔ وہ اپنے دَور کی سیاست سے اگرچہ الگ تھلگ رہے لیکن اس کے عمومی پہلوؤں کی جو منظر کشی کی ہے، اس میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کی بھی ایک زیریں لہر برابر موجود رہتی ہے۔ جزیرۂ بورینو کے سفر نامے کے ابتدائی حصے میں انھوں نے خود کو کانگریس پارٹی کے ایک جوشیلے کارکن اور مقرر کے طور پر پیش کر کے، گویا پارٹی کے اندرونی اسٹرکچر کی بڑی حد تک ایک حقیقت آمیز تصویر پیش کر دی ہے:

''غرض اسی قسم کے خیالات تھے کہ میں خدمت (ملازمت) سے استعفیٰ

دے کر کانگریس کا سرگرم ممبر بن گیا۔ پہلے ہی سالانہ جلسے میں وہ دھواں دھار تقریر کی اور گورنمنٹ پر ایسے آوازے کسے کہ اخباروں میں میری دھوم مچ گئی۔ لیڈروں نے میری پیٹھ ٹھونکی، پریسیڈنٹ نے مجھے کانگریس کا روحِ رواں کہا، سی آئی ڈی کے رجسٹروں میں مجھے بدمعاش لکھا گیا اور گورنمنٹ کے ہاں میرے نام کے سامنے 'مشتبہ' کا حاشیہ چڑھا دیا گیا۔"

مرزا کی اس لیڈری کا دوسرا پہلو بھی قابلِ ذکر ہے اور شاید اس صورتِ حال میں آج بھی بہت کم تبدیلی آئی ہے۔ ہم لوگ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے حالات اب بھی سنتے اور دیکھتے رہتے ہیں:

"مجھے امید تھی کہ دوسرے سال کانگریس میں پریسیڈنٹ، میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا مگر میں نے دیکھا کہ یہاں تو 'اندھا بانٹے ریوڑیاں، ہر پھر کر اپنے ہی کو دے" کا رنگ ہے۔ روپیہ پیسہ مانگو تو دینے میں ذرا بھی انکار نہیں، ہاں کانگریس کی پہلی صف میں آنا چاہو تو دھکے دے کر پیچھے ہٹا دیں۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ کانگریس کیا ہے، بس یاروں کی لمیٹڈ کمپنی ہے۔ بہت جی چاہا کہ چھوڑ بیٹھوں، پھر سوچا کہ کون جا کر دھوپوں میں پھرے، جریبیں گھسیٹے، قلیوں اور میٹوں سے تو تو میں میں کرے، بس یہیں پڑے رہو۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہو، دنیا دیکھتے ہو، اچھے سے اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہو، بڑے سے بڑے لوگوں میں گھرے رہتے ہو، دعوتیں کھاتے ہو، شریفوں سے اپنی گاڑیاں کھنچواتے ہو اور کرتے کیا ہو، بس یہی نا کہ گورنمنٹ کو بے نقط سنا دیتے ہو! ایسی اچھی نوکری کہاں ملے گی؟"

مرزا فرحت اللہ بیگ کی زمانہ شناسی کا ایک پہلو تو وہ تھا جو اوپر بیان ہوا، اب یہ دوسرا پہلو بھی دیکھیے:

"میں اس الٹ پھیر میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ بغیر ٹکوں کے دنیا کیونکر چلائی جا سکتی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں دم نہ تھا نہ سہی، قلم میں روانی اور سر میں بھیجا تو تھا۔ صرف جون بدل لینی کافی تھی۔ لیڈروں کے حلقے سے نکل کر

اہلِ قلم کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم نے بتادیا تھا کہ
دنیا میں مضمون کی بہ نسبت، الفاظ کی زیادہ ضرورت ہے۔ کسی کو دلائل
سے قائل کرنا دشوار ہے، ہاں پھبتیاں کہہ کر اور آوازے کس کر بڑے
سے بڑے کا خاکہ اڑایا جا سکتا ہے۔"

اس آخری فقرے کی صداقت آج کے دَور میں بھی آزمائی جا سکتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے سیاسی مزاح کی ایک اور دلچسپ تصویر ان کے ایک بہت اچھے مضمون "آزاد نگارستان اور داداجان" میں نظر آتی ہے۔ اس مضمون میں جہاں ایک طرف ایک خیالی پارلیمانی نظام (مرزا فرحت کے زمانے میں ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا اور نہ دہلی کی پارلیمنٹ قائم ہوئی تھی) اور متعلقہ الیکشن کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، وہیں پرانے زمانے کے ایک بزرگ (داداجان) کی پارلیمان کی ممبری اور اس کے اجلاس میں شرکت کا بے حد ظریفانہ منظر پیش کیا گیا ہے جس کے بعض نمونے کچھ اس طرح ہیں:

چلنے کے دن صبح ہی سے داداجان کا بناؤ سنگھار شروع ہو گیا۔ موٹے گاڑھے
کا کوئی تین گز کا منڈاسا (پگڑی) باندھا، بدن پر گاڑھے کی مرزئی پہنی،
گاڑھے کی تہمد باندھی، پاؤں میں ادھوڑی استر کا نعل دار جوتا پہنا، روپیوں
کی ہمیانی (لمبی تھیلی) کمر میں لپیٹی اور پارلیمان کے پورے ممبر بن گئے۔
منجھولی میں بیٹھ کر گھر سے نکلے۔ اسی حیص بیص میں اسٹیشن آگیا۔ گاڑی
کے آنے میں دیر تھی۔ داداجان کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کبھی ریل کو برا
بھلا کہتے، کبھی ریل والوں کو، کبھی کہتے "بھئی ہم سے یہ ریل ویل چلانی
مشکل ہے۔۔۔ میں تو کمیٹی میں جاتے ہی کہوں گا کہ اس ریل کو پرانی سرکار
کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ ان کی دیکھی بھالی چیز ہے، وہی اس کے کل پُرزوں کو
خوب جانتے ہیں۔ ہم نئے آدمیوں سے یہ کام سنبھلا ہے، نہ سنبھلے گا۔"

اس کے بعد پارلیمنٹ کے ایوان میں داداجان کے داخلے کا منظر آتا ہے جس کو مرزا فرحت کے جادو نگار قلم نے بڑا دلچسپ اور ظرافت خیز بنادیا ہے:

"شامتِ اعمال سے (اوپری حصے کی) یہ گیلری عورتوں کی تھی۔ انھوں نے
جو دیکھا کہ ایک دہقان، جوتیاں بغل میں دبائے اندر گھسا آرہا ہے تو غل

مچادیا۔ کسی کو چکر آیا کوئی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بیگم صاحبہ نے بے دم ہو کر دادا جان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ نیچے پارلیمان کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس شور و غل سے وہ بھی بند ہو گیا۔ آخر نیچے سے دو تین افسروں نے آکر دادا جان کو اس گیلری سے نکال کر مردوں کی گیلری میں ٹھونس دیا۔

یہ تھوڑی دیر تک پریشان حال بیٹھے رہے۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنی جگہ سے اٹھے اور لوگوں کی کہنیاں کھاتے، دھتکاریں سنتے، گیلری کے جنگلے تک جا پہنچے اور جنگلے پر دو کہنیاں ٹیک، جھک کر نیچے کا تماشہ دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب سے پوچھا "ارے بھئی یہ نیچے کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے کہا "پارلیمان کا اجلاس" پھر سوال کیا "نیچے جو لوگ بیٹھے ہیں وہ کون ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "پارلیمان کے ممبر ہیں" اتنا سننا تھا کہ دادا جان نے نعرہ مارا "ٹھہرو ٹھہرو! ہم کو بھی نیچے آنے دو۔ یہ ہمارے بغیر کیوں اجلاس کیا جا رہا ہے؟ اس آواز سے سب لوگوں کی نظریں مردانہ گیلری کی طرف خود بخود پھر گئیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی صاحب جو پہلے زنانہ گیلری میں آفت بپا کر چکے تھے، اب دوسری گیلری میں کھڑے، اجلاس بند کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ صدر نشین نے بڑے زور سے "خاموش" کہا۔ دادا جان سمجھے کہ مجھے خاموش کرنے کو کہا جا رہا ہے، وہیں سے چیخ کر بولے "آخر ہم کیوں چپ رہیں! ایک تو ہمارے بغیر کمیٹی شروع کر دو اور پھر کہو کہ چپ رہو۔ ہم یہاں پر بولنے آئے ہیں یا چپ رہنے کو؟"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مرزا فرحت کو ایک معمولی سے خیال سے، ایک پورا مرقع تیار کر لینے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ آزاد نگارستان اور دادا جان کے فرضی واقعے میں ایک طنزیہ پہلو بھی پوشیدہ ہے کہ جب سیاسی آداب و مزاج سے ناواقف لوگ، محض اپنی سماجی حیثیت کے بل بوتے پر پارلیمان کے ممبر بن کر اجلاس میں حصہ لینے پہنچ جائیں گے تو اسی طرح کی مضحکہ خیز صورت حال پیش آئے گی۔

"یادِ ایامِ عشرتِ فانی" میں مرزا فرحت نے اپنی طالب علمی کے زمانے کا حال لکھا

ہے اور اس میں اپنے کچھ ماسٹروں کے قلمی خاکے بھی پیش کیے ہیں جس سے ان کی ظرافت اور خوش طبعی کے کچھ اور نئے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اپنے اسکول کے ایک ماسٹر صاحب کا حال اس طرح سناتے ہیں:

"اس کے کمرے کے بیچ کے حصے میں حساب کے مولوی صاحب بیٹھتے تھے۔ بڑے مضبوط اور گٹھیلے جسم کے آدمی تھے۔ پہلے حساب سکھاتے تھے، پھر عربی کے مولوی صاحب ہوگئے۔ گول چہرہ، سانولی رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، سرخ بھرواں داڑھی، سر پر کالی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر کشمیرے کی اچکن، اس پر کشمیری کام کا چغہ، شاعر تھے اس لیے مذہب سے لاپروا تھے۔ ہر وقت گنگناتے رہتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا محو ہو جاتے تھے کہ ساری جماعت اٹھ کر چلی جاتی تھی اور ان کو خبر بھی نہ ہوتی۔ بلا کے ہوشیار آدمی تھے۔ متین اور سنجیدہ ایسے تھے کہ خدا کی پناہ۔۔۔ میں پانچ برس مدرسے میں رہا۔ اس کے بعد بھی کئی برس تک ان سے ملنے کا اتفاق رہا لیکن جو اچکن اور چغہ میں نے پہلے دن ان کو پہنے دیکھا تھا، وہ ان سے نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹا۔ سنتا ہوں اب ان کا انتقال ہو گیا ہے، شاید اسی اچکن اور چغے میں دفن ہوئے ہوں۔"

مضامینِ فرحت کی سات جلدوں میں شامل بیشتر مضامین واقعاتی مزاح پر مبنی ہیں۔ مزاح کا سارا لطف ان کے کہانی کہنے کے انداز میں سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنے تخیل سے جو مضحک صورتِ حال پیش کرتے ہیں، وہ اصلیت سے پرے نہیں ہوتی، تاہم اس میں کچھ ایسے پہلو نکال لیتے ہیں جن کو پڑھ کر قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کا ایک مضمون ہے "اڈیٹر صاحب کا کمرہ" جس میں انھوں نے اخبارات کے اڈیٹروں کی چالاکی اور ہیرا پھیری کی پول کھولتے ہوئے، ان کے اس طنطنے کو بھی ظاہر کیا ہے جو اردو اخبار کے اڈیٹروں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ اڈیٹر صاحب اپنے مددگار سے کہتے ہیں۔

"میں تو اخبار اور رسالہ نکال کر جنجال میں پڑ گیا۔ ان نامہ نگاروں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہی بل پر اخبار چلتا ہے۔ قسم خدا کی، اگر ان کے مضمون بغیر ترمیم کیے، جیسے کے ویسے چھاپ دوں تو آج

ان سب کی قلعی کھل جائے۔ جو صاحب ہیں یہی لکھتے ہیں کہ مضمون لکھنے کی فرصت نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مضمون لکھنے کے لیے ایسی کون سی دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ کوئی سمجھ کی بات لکھنی ہو تو واقعی دماغ پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ یہاں تو میاں! کام کو نہیں نام کو پوچھتے ہیں۔ یہ تھوڑی دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا ہے، یہ دیکھتے ہیں کہ کس نے لکھا ہے۔"

یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن جب وہ ایڈیٹر کی چک پھیریوں کو بے نقاب کرتے ہیں تو صورتِ حال واقعی بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب اپنے مددگار سے فرماتے ہیں:

"دیکھی آپ نے ان کی چال! دو پیسے کا کارڈ لکھا اور دو کام نکال لیے۔ ایک تو مضمون لکھنے سے انکار کر گئے، دوسرے خود مجھ سے مضمون لکھنے کا تقاضہ کر بیٹھے۔ خیر! کئی مضمون بھیج چکے ہیں، ان کی خواہش بھی پوری کر دو۔ احسان الرحمٰن مرحوم کا جو مضمون پچھلے مہینے آیا تھا، وہ میرے نام سے بھیج دو۔"

مددگار۔ "ممکن ہے کہ احسان کا کوئی عزیز یا رشتے دار بھانڈا پھوڑ دے!"

اڈیٹر۔ "مہربانی کر کے آپ مجھے مشورہ دینے کی تکلیف نہ اٹھایا کیجیے۔ میں نے آپ کو اپنا مددگار مقرر کیا ہے نہ کہ اتالیق۔ افسوس ہے کہ آپ اتنے دن سے یہاں کام کر رہے ہیں اور ابھی تک اسی طرح کورے کے کورے ہیں۔ احسان مرحوم کے بھائی بند رونے پیٹنے میں لگے ہیں یا اخبار پڑھنے میں؟ تھوڑے دنوں میں پرچہ پرانا ہو جائے گا۔ پھر خدانہ خواستہ اس کو پڑھتا ہی کون ہے؟ لانا یہ سامنے والا خط دینا۔ اوہو! آپ ہیں۔ خدا کسی کو ایسا بھیک منگا نہ کرے۔ مضمون لکھتے ہیں تو ہم پر کون سا احسان کرتے ہیں۔ اجی احسان ہمارا ہے کہ ان کا مضمون چھاپ دیتے ہیں، ورنہ کسی اور کو مضمون بھجیں تو الٹا منہ پر مار دے اور ان حضرت کی حالت یہ ہے کہ مضمون بھیجا اور ساتھ ہی ہاتھ

پھیلا دیا کہ لاؤ کچھ دلاؤ۔ اجی مددگار صاحب آج کوئی منی آرڈر آیا ہے؟"

مددگار۔ "جی ہاں! سوا چھ روپے کا منی آرڈر آیا ہے۔"

اڈیٹر۔ "اچھا تو سوا دو روپے ان کو بھیج دو اور باقی چار روپے کاغذ والے کے حساب میں دے دو۔"

اڈیٹر کے کمرے کے حوالے سے مرزا فرحت نے گویا اردو صحافت کے ایک ایسے رخ کی نشان دہی کردی ہے جس کی واقعیت سے انکار کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن اب کچھ ذکر جودھپور والے چغتائی صاحب، یعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا کہ اس میں بھی اڈیٹر صاحب کی کارفرمائیوں کا ایک اور رخ بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اڈیٹر۔ واللہ یہ بھی عجیب آدمی ہے۔ ابھی آپ کو پیدا ہوئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں جو اتنی شیخیت آگئی ہے۔ سمجھتے ہوں گے کہ میں بھی کچھ لکھنے لگا ہوں۔ خیر رہنے دو۔ ان کی کتاب "روحِ ظرافت" پر وہ ریویو لکھوں گا کہ میاں یاد ہی کریں گے۔ ہم نے بھلے آدمی کے، مضمون چھاپ چھاپ کر اور تعریفیں کر کر کے یہاں تک پہنچایا اور ہماری بلّی ہمیں سے میاؤں کرنے لگی۔ خدا کی قدرت ہے۔ جودھپور کو دیکھو اور اردو زبان کو دیکھو۔ ایک حرف تو صحیح لکھتے نہیں اور اس پر زبان دانی کا یہ دعویٰ ہے کہ معاذاللہ! دیکھنا! کل ان کی کتاب اور اردو کی دو تین لغات صبح ہی صبح مجھ کو دے دینا۔ ایک مضمون لکھ کر ان کو ٹھنڈا کیے دیتا ہوں۔"

اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا فرحت کا مشاہدہ گہرا اور سوجھ بوجھ غضب کی تھی۔ انھوں نے خود کوئی اخبار یا رسالہ نہیں نکالا مگر صحافت کے اندرونی معاملات سے ان کی یہ واقفیت حیرت انگیز ہے۔ اردو اخبار کے ایک اڈیٹر کا جو کیری کچر یہاں انھوں نے پیش کیا ہے، وہ ایک طرف سے تو سچائی سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کا طنزیہ پہلو آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔

یہ جو کسی ناقد کا قول مشہور ہے کہ "فرحت اللہ بیگ اپنا مواد، مردوں سے، پطرس

زندوں سے اور رشید احمد صدیقی شعر و ادب سے لیتے ہیں" تو اس میں جزوی صداقت تو ہو سکتی ہے لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی ہم عصر زندگی کے زندہ علامتی کرداروں کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے جس میں ان کے مشاہدے،، مطالعے، تجربے اور اسلوب کی لطافت اور شوخی کا ایک خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ ان کے سب مضامین یکساں معیار کے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ "وہ زندگی کے معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کے بعض مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں ا. تہاد بھی تھا لیکن ان سب کے باوجود، ان کی کچھ حدود تھیں اور وہ ہمیشہ اپنی حدود ہی میں رہے۔" کسی شخص کا اپنے حدود میں رہنا ہی اس کی دانشمندی کی دلیل ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مزاح اور زندہ دلی کے بارے میں اپنا نظریہ اس طرح بیان کیا ہے:

> "زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں۔ زندہ دلی اور مردہ دلی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے انہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکتب کی صورت۔ غرض دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک روتی صورت، دوسری ہنستی صورت۔ کوئی انشا بنا اور کوئی میر۔" (کہانی)

آج کی پیچیدہ اور تناؤ بھری زندگی میں مرزا فرحت کی یہ سہل اور سادہ تقسیم، مناسبِ حال نہیں معلوم ہوتی۔ غمگین مزاج لوگ بھی اکثر ہنسنے یا مسکرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور زندہ دل لوگ بھی کبھی کبھی رنج و غم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہنسنا اور رونا زندگی کے ناگزیر مظاہر ہیں جس سے اس زندگی میں کسی کو مفر نہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ مزاح کے چھینٹے تپتی دھوپ میں بارش کی خوشگوار بوندوں کا کام کرتے ہیں اور وقتی طور پر ہی سہی، لیکن زندگی کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

نذیر احمد کی کہانی

مرزا فرحت اللہ کا شاہکار مضمون، جس سے ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد قائم ہوا، نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی ہے۔ مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) کا یہ طویل اور دلچسپ خاکہ، پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق کے رسالے "اردو" میں جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں جس بے باکی اور بے خوفی لیکن احترام کا پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے، مولوی نذیر احمد کی بھاری بھر کم شخصیت کے تمام پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے شاید ان کے بعض عزیزوں کو شکایت بھی پیدا ہو گئی تھی، لیکن مرزا فرحت بھی آخر انھی کے شاگرد تھے، انھوں نے مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے بعد یہ مضمون "مضامین فرحت" حصہ دوم میں شامل ہوا اور الگ سے کتابی شکل میں بار بار چھپتا رہا اور آج تک اس کے نہ معلوم کتنے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب بعض جامعات میں اردو ادب کی درسیات میں بھی شامل ہے، اس لیے پبلشر، طلباء کی ضرورتوں کے پیشِ نظر، اس کو متواتر چھاپتے رہتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد، اردو فارسی، عربی کے زبردست عالم اور یگانۂ روزگار انسان تھے۔ ان کی شہرت بہ حیثیت ناول نگار زیادہ ہوئی کیونکہ اس میں ان کو اوّلیت کا درجہ حاصل تھا، لیکن وہ ایک بے مثل مقرر بھی تھے اور انگریزی ٹھیک سے نہ جاننے کے باوجود، انھوں نے انڈین پینل کوڈ کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "تعزیراتِ ہند" تجویز کیا جو آج بھی اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ ان کا بچپن بہت غربت میں بسر ہوا لیکن اپنی محنت، لگن اور

خداداد صلاحیت سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ کچھ دنوں تک ریاست حیدر آباد میں ایک اعلیٰ عہدے پر خدمات انجام دیں۔ ان کے دو ناول توبۃ النصوح اور ابن الوقت بہت مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے بڑے ناول اور اخلاق و مذہب سے متعلق دیگر کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کو دہلی کی ٹکسالی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ خواتین کی آپس میں بولی جانے والی زبان سے ان کی گہری واقفیت تھی اور محاورات اور ضرب الامثال سے اپنی عبارت دلچسپ بنانے کا ان کو بڑا چسکہ تھا جس نے ایک بار ان کو خاصی مصیبت میں بھی ڈال دیا۔ مزاج میں ظرافت اور خوش دلی بہت تھی، اس لیے وہ خوش مذاق طلباء کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۰۳ء میں ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب دہلی کے مشن کالج میں بی۔اے کی کلاس میں داخلہ لیا تو وہاں عربی زبان کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے آفر کیا مگر اتفاق ایسا کہ اس کے فوراً ہی بعد وہاں کے عربی استاد استعفیٰ دے کر حج کرنے چلے گئے اور کالج کے منتظمین نے کسی دوسرے عربی ٹیچر کا تقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ اب مرزا فرحت اور ان کے دوست اور ہم جماعت غلام یزدانی عرف ''دانی'' کو عربی پڑھنے کے لیے کسی مولوی کی تلاش ہوئی۔ دو جگہ ناکام ہونے کے بعد آخر انھوں نے مولوی نذیر احمد کا دامن پکڑا اور بڑی مشکلوں سے ان کو عربی پڑھانے پر راضی کیا۔ اس زمانے میں ٹیوشن کا رواج نہ تھا اور نہ شاگرد اپنے استاد کو نذرانہ پیش کرتا تھا۔ علم کی ترسیل محض خدمت کے جذبے سے کی جاتی تھی۔ یہ دونوں دوست دو سال تک بغیر ایک دن کا ناغہ کیے ہوئے، مولوی صاحب کے مکان پر عربی پڑھنے کے لیے جاتے رہے۔ اس دوران مرزا فرحت نے ان کی سیرت و شخصیت کا غور سے مطالعہ کیا اور اس میں جو کچھ حاصل ہوا، اسی کا دلچسپ اور ظرافت آمیز بیان ''نذیر احمد کی کہانی'' میں سمویا ہوا ہے۔ اس مرقعے کے بارے میں مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ ''یہ مرزا فرحت کے آرٹ کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔ اس مضمون میں مرزا نے عقیدت اور طنز کو سمو کر، اردو ادب میں کردار نویسی کے ایک نئے ڈھنگ کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ کہانی ایسی ہے کہ اس کی مثل نہ انگریزی میں کوئی ایسی مختصر اور چلتی پھرتی زندہ تصویر موجود ہے اور نہ کسی اور زبان میں ہے۔''

مولوی نذیر احمد کی زندگی کے حالات اور واقعات تو اردو ادب کی تاریخ کی تمام

کتابوں میں مل جاتے ہیں لیکن اصل نذیر احمد کو اگر زندہ، توانا، چلتے پھرتے، ہنسی مذاق کرتے، تعلیم دیتے اور کاروباری معاملات کو نمٹاتے ہوئے دیکھنا ہے تو اس مضمون کے علاوہ کہیں اور یہ چیزیں نظر نہیں آئیں گی۔ مرزا فرحت کا کمال یہ ہے کہ اس مرقع نگاری میں جہاں انھوں نے استاد کی تعظیم اور ادب کو ملحوظ رکھا ہے، وہیں ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں کو بھی نگاہ میں رکھا ہے اور ان کی روزمرہ زندگی کے سبھی پہلوؤں کو بڑے دلچسپ انداز میں اجاگر کر دیا ہے۔ چونکہ مرزا فرحت کے اسلوبِ تحریر میں شوخی اور ظرافت کو خاص مقام حاصل ہے، اس لیے اس خاکے میں نذیر احمد کی زندگی کے کمزور پہلوؤں کا ظریفانہ اور شوخ بیان گراں نہیں گزرتا ہے بلکہ ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس مرقعے میں یہ شوخی اور ظرافت نہ ہوتی تو یہ محض ایک پھیکے رنگ والی تصویر بن کر رہ جاتا جس کی مشکل ہی سے کوئی قدر و قیمت ہوتی۔

مرزا فرحت نے اپنی اس شوخ نگاری کا جواز بھی خود ہی فراہم کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اب رہا طرزِ بیان، تو اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں، کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں، متانت کو دخل دینا، ان کا منہ چڑانا ہی نہیں، ان کی توہین کرنا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ سید انشا کو میر اور مارک ٹوئن کو ایمرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔" (نذیر احمد کی کہانی کا ابتدائیہ)

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس مرقعے کے تین بنیادی ستون ہیں، یعنی خوش مذاقی، شوخ چشمی اور صاف گوئی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے ان تینوں کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، تاہم اس میں عقیدت، محبت اور ہمدردانہ نقطۂ نظر کے عناصر بھی شروع سے آخر تک موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ تصویر اور بھی دلکش اور دلپذیر ہو گئی ہے۔

مولوی نذیر احمد سے پہلی ملاقات میں جب مرزا فرحت، عرض، مدعا زبان پر لائے اور ان سے عربی زبان پڑھانے کی درخواست کی تو مولوی صاحب نے فرمایا "عربی چھوڑو، سائنس

پڑھو، بیٹا! آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں مثل ہے "پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔" فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بیچنا بھی نہ آئے گا۔" مرزا فرحت کہتے ہیں کہ "ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد کے نیچے کے، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون در آسکتا ہے۔ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے، اس کے بعد کھل کھلا کر ہنس دیے۔ دانی کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے کہ یہ بڑا غرب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بد معاش ہے، جاؤ کسی دوسرے مولوی کو تلاش کرو۔ دتی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو انکار نہ کرتا۔"

اس پہلی ہی ملاقات سے مرزا فرحت کو اندازہ ہو گیا کہ مولوی صاحب نہ صرف خوش مذاق آدمی ہیں بلکہ شوخی و ظرافت کو پسند بھی کرتے ہیں۔ بس اتنا اشارہ کافی تھا۔ اس کے بعد سے دو سال تک مرزا فرحت اور میاں دانی، مولوی صاحب سے عربی کا درس بھی لیتے رہے، اپنے قول و قرار پر ایمانداری سے عمل بھی کرتے رہے لیکن ساتھ ساتھ ان کے اطوار و عادات کا مطالعہ بھی کرتے رہے اور اپنی پُر لطف اور لچھے دار باتوں سے مولوی صاحب کو خوش وقت بھی کرتے رہے۔ مولوی نذیر احمد کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا مگر ان کی یہ کہانی، ان کے انتقال کے پندرہ سال بعد ۱۹۲۷ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا مرزا فرحت نے اپنے طالب علمی کے دور میں ہی یہ سب باتیں نوٹ کرلی تھیں یا پھر محض اپنی یادداشت سے چودہ پندرہ برس بعد یہ دلچسپ مرقع تیار کرلیا۔ اصلیت جو بھی ہو لیکن مرزا فرحت نے ان کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت کو نظر میں رکھا، ان کے مزاج اور طبیعت سے آشنائی پیدا کی، ان کی عادات و اطوار سے پوری واقفیت حاصل کی اور پھر ان کی شخصیت کا جو مرقع تیار کیا، وہ اپنے آپ میں ایک مثال بن گیا۔ نذیر احمد کے تمام ہم عصر حالی، شبلی، آزاد، ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال سب اپنے اپنے کارناموں کی بدولت زندہ ہیں مگر نذیر احمد اپنے وقیع کارناموں کے ساتھ ساتھ مرزا فرحت کے اس مرقع کی وجہ سے زندہ بلکہ زندہ جاوید ہو گئے۔

مولوی نذیر احمد کی گھریلو شخصیت کی چند جھلکیاں، جو ان کی جسمانی ہیئت، لباس، کھان پان اور حقہ نوشی سے متعلق ہیں، مرزا فرحت کے لفظوں میں، کچھ اس طرح ہیں:

"کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا، بے ضرورت ہی نہیں، تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہبند باندھتے تھے۔ اس کے پلّو اڑسنے کے بجائے ادھر ادھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے، اگر اٹھنا ہی ہوا تو پہلے اندازہ کر لیتے تھے کہ اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں! ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔۔۔ کلّہ جبڑا ابڑا زبردست پایا تھا۔ چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لیے اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔۔۔ جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف سنائی دیتا تھا۔ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے روزمرہ کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پاجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبّہ۔ چونکہ سرج الدین صاحب سے لین دین تھا، اس لیے لال نری کا سلیم شاہی جوتہ زیادہ استعمال کیا کرتے تھے۔ پھر بھی وقت بے وقت کے لیے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں، پالش ہونے کی نوبت کبھی نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ انھیں کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے جوتوں کو برداشت کرتا تھا"

"جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے۔ اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقّہ جس کی حقیقت کماحقہٗ

بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بڑا شوق تھا مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ، پاس بیٹھنے ولوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسے کی دو والی اور نیچہ تو خدا کی پناہ۔ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت سے محو ہو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارداہ بھی کیا مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔"

"خوش خوراک تھے اور مزہ لے لے کر کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت (ہاف بوائل) انڈے ضرور ہوتے تھے۔ میوے کا بڑا شوق تھا۔ ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ بڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی۔ کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا۔ خیر، ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے، ان کے لیے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہو جاتا۔ البتہ ہم دونوں کی صلانہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے "بھئی، کیا مزے کا خربوزہ ہے، میاں کیا مزے کا آم ہے" مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہیں کہا بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو کیسا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارداہ تھا) کہ اگر مولوی صاحب جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی سوانح عمری نہیں لکھی ہے، صرف خاکہ لکھا ہے لیکن باتوں باتوں میں خود ان کی زبانی ان کے بچپن کے حالات کو بھی بیان کر دیا ہے کہ کس طرح انھوں نے انتہائی غربت میں اپنا بچپن گزارا لیکن علم کے شوق اور ذاتی لگن نے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھول دیں اور وہ علم و فضل کے اعتبار سے بھی اور دنیاوی جاہ و منصب کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور قابل ذکر شخصیت کے مالک بن گئے۔ نذیر احمد خود کو "خود ساختہ آدمی" کہتے تھے اور "اپنی مدد آپ کرو" کے اصول کے بے حد قائل تھے۔ اگر مرزا فرحت، نذیر احمد کے بچپن کے حالات کو قلم بند نہ کر لیتے تو شاید اس پر پردہ ہی پڑا رہ جاتا۔ ساتھ ہی انھوں

نے نذیر احمد کی آخری عمر کی کیفیت بھی بیان کر دی ہے جب وہ اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود اپنے مکان سے کشمیری دروازے تک کا راستہ پیدل ہی طے کرنے پر آمادہ تھے اور مرزا فرحت کے اصرار کے باوجود، گاڑی پر سوار ہو کر آمد و رفت کو اپنی وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ حیدر آباد سے واپس آ کر دہلی میں مستقل قیام کے چشم دید واقعات تو مرزا فرحت نے اس کہانی میں بیان کر ہی دیے ہیں۔

نذیر احمد کی کہانی کے بارے میں مولوی عبدالحق نے صحیح لکھا ہے کہ ''مولانا نذیر احمد کے حالات پر بہت سے مضامین لکھے گئے مگر کہیں ان کی زندگی اور سیرت، اخلاق و عادات، ان کے اوقات و مشاغل اور پرائیویٹ لائف کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا جو اس کہانی میں ہے۔ اس سچی بایو گرافی سے گراں بہا فائدے آئندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد ایک سچے اور کامیاب طالب علم کی بے نظیر مثال ہیں۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے شوخیٔ اسلوب کی ساری کرامتیں، اس دلچسپ خاکے میں انڈیل کر اردو ادب کو ایک نایاب تحفہ دیا ہے۔ محاروں اور مثلوں کی کثرت اور چمک بار بار نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے، حالانکہ ایک موقعے پر خود انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ''محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا ''مولوی صاحب! آپ نے محاروں کی کوئی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورے کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو۔ جناب والا، کسی اہلِ زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاروں پر حاوی ہے۔ یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں، جو دوسروں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں، دہلی والے ہیں۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ محاوروں کی بھرمار پر ایک طرف وہ نذیر احمد کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنی تحریروں میں اتنے زیادہ محاورے پھنساتے ہیں کہ بعض اوقات وہ غیر ضروری اور بے محل معلوم ہونے لگتے ہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ دلّی کی ٹکسالی زبان پر فاضلانہ قدرت رکھتے تھے اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی زبان آسان اور صاف شفاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی، ژولیدگی یا کج مج بیانی نہیں ہے۔ دہلی کی گزشتہ تہذیب کے موثر بیان میں اس وقت کی زبان اور مخصوص محاوارات سے آشنائی کا بھی ایک خاص رول ہے، جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طویل مضمون "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" جو "دہلی کی آخری شمع" کے نام سے بار بار ایک مختصر کتاب کی صورت میں شائع ہوتا رہا ہے، اپنے ڈرامائی عناصر، تہذیبی پہچان اور پُر لطف اندازِ بیان کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور کئی بار اپنی اصل صورت میں یا کچھ مختصر کر کے اسٹیج پر کامیابی سے پیش کیا جاچکا ہے۔ یہ مضمون سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے رسالے "اردو" میں، اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا اور انھیں کے زیرِ اہتمام "اورنگ آباد کالج ڈے" کے موقعے پر اس کو اسٹیج پر کامیابی سے پیش کیا گیا۔ اس وقت اس کی ہدایت کاری کے فرائض خود مرزا فرحت نے انجام دیے تھے۔

مرزا فرحت کو اس مشاعرے کے احوال بیان کرنے کا خیال کیسے آیا، اس کی وضاحت انھوں نے مضمون کے شروع ہی میں کر دی ہے۔ اس کی تحریک ان کو مومن خاں مومنؔ کی ایک تصویر سے ملی جو ان کو اپنے پرانے کاغذات میں کہیں مل گئی تھی۔ آبِ حیات میں شعرائے قدیم کی لفظی تصویریں ان کے ذہن میں تازہ تھیں۔ پھر انھیں مولوی کریم الدین کے تذکرے "طبقاتِ شعرائے ہند" سے ایک مشاعرے کی جانکاری ملی جو ۱۲۶۱ ہجری مطابق ۱۸۴۵ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا جس میں اس تذکرے کے طبقہ چہارم کے شعراء شریکِ بزم تھے۔ مرزا فرحت نے ان دونوں کو ملا کر اپنے ذہن میں ایک ایسے مشاعرے کا خاکہ تیار کیا جس میں دورِ آخر کے تمام چھوٹے بڑے مگر نمائندہ شاعروں کا اجتماع ہو اور دہلی کی آخری بہار کا پر کیف تہذیبی منظر پیش کیا جاسکے۔ اس مشاعرے کے

انعقاد کا سہرا انھوں نے مولوی کریم الدین کے سر باندھ دیا اور خود کے بری الذمہ ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا کہ "جب میں اپنی تمام محنت مولوی کریم الدین صاحب کی نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہیے، مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل کھول کر کہیے۔ میں خوش میرا خدا خوش۔"

مشاعرے کی پوری روداد انھی مولوی کریم الدین کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ مولوی صاحب اس مشاعرے کے محرک ضرور تھے مگر اس کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے کیا تھا جو مرزا غالبؔ کے بھانجے اور خاندان لوہارو کے ایک ممتاز فرد تھے۔ یہ وہی عارف ہیں جن کے عین عالمِ جوانی میں انتقال پر غالبؔ نے ایک لازوال مرثیہ کہا تھا جو ان کے متداول اردو دیوان میں موجود ہے اور اردو کے شخصی مرثیوں میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشاعرے کے انعقاد کی منظوری لینے اور اس میں شریک ہونے یا کم از کم اپنا کلام بھیجنے کی دعوت دینے کے بہانے، مرزا فرحت نے مولوی کریم الدین کو قلعۂ معلیٰ میں آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں بھی باریاب کروادیا۔ اس کا کچھ احوال اس طرح ہے:

> "چوبدار نے آکر کہا 'چلیے' اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی طرح حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے، نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجالاؤ" میں نواب زین العابدین سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دوہرا ہو کر سات تسلیمات بجالایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔
>
> حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ پائنتی مرزا فخرو پَیر دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا! میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، ستر برس سے اوپر عمر تھی۔ بال سفید بھک ہو گئے تھے۔ چہرے میں جھریاں تھیں لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے، آواز میں کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک بَر کا پاجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتہ

زیب تن تھا۔۔۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ بادشاہت سلامت نے فرمایا۔ ”اماں، تمھارا ہی نام کریم الدین ہے! کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو!“

اس طرح کے لفظی مرقعے مرزا فرحت اللہ بیگ نے کہیں تصویر دیکھ کر، کہیں تذکروں میں پڑھ کر اور زیادہ تر اپنے زمانے کے بزرگوں سے زبانی حالات سن کر تیار کیے ہیں لیکن ان میں ایسی ہنر مندی اور چابکدستی ہے کہ آنکھوں کے سامنے ایک چلتی پھرتی زندہ تصویر گھومنے لگتی ہے۔ ان لفظی تصویروں میں نہ تو مبالغہ ہے، نہ بناوٹ اور نہ مضحکہ خیزی بلکہ ہر تصویر، اصل شخصیت کا ہوبہو چربہ ہے۔ مرزا فرحت کی لفظی مصوری کا موازنہ، مولانا محمد حسین آزاد کے لفظی مرقعوں سے بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے یہاں مبالغہ بھی ہے اور غیر ضروری رنگ آمیزی بھی۔

مشاعرے کے انعقاد کے لیے مرزا فرحت نے نواب زین العابدین خاں عارف کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ وہ حقیقتاً شہر دہلی میں کئی عالی شان مشاعرے منعقد کروا چکے تھے اور چونکہ وہ شہر کے مشاعروں کی چپقلش سے الگ رہنے والے ایک غیر متنازعہ شخص تھے، اس لیے لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے مشاعروں میں خوشی خوشی شریک ہوتے تھے۔ اس یادگار مشاعرے میں صرف ان کی دلآویز شخصیت کی وجہ سے ذوق بھی شریک ہوئے، غالب اور مومن بھی آئے، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مفتی صدر الدین آزردہ بھی رونقِ محفل ہوئے حالانکہ ان سب میں آپسی من مٹاؤ کافی تھا۔

مشاعرے کی جگہ کے لیے مبارک بیگم کی وسیع و عریض حویلی کا انتخاب کیا گیا جس میں مولوی کریم الدین نے اپنا مطبع قائم کر رکھا تھا۔ انھوں نے پورا مکان خالی کر کے اس کو عارف کے سپرد کر دیا تھا اور خود آٹھ دس روز کے لیے ان کی حویلی میں اٹھ آئے تھے۔ عارف نے اس مختصر مدت میں اپنی نگرانی میں سارا کام کروایا اور اسے ایک شاہی مشاعرہ گاہ میں تبدیل کر دیا۔ ۱۴ رجب، یعنی مشاعرے کی شام کو جب مولوی کریم الدین باہر نکلے تو ان کو اپنا مکان اور اس کی روشنی اور سجاوٹ دیکھ کر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ان کا مکان ہے۔ اس کا کچھ حال انھی کی زبانی سنیے:

”بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی، ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔

کوئی کہتا تھا "میاں، یہ کریم الدین کون ہیں؟" کوئی کہتا "بھئی، کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔" میں یہ باتیں سنتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا، قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک پر دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے۔ کٹورا بج رہا ہے۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزارِ آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ! یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں!"

اصل مشاعرہ گاہ کا نقشہ مصنف نے اس طرح کھینچا ہے:

"صحن کو بھروا کر، تختوں کے چوکے اس طرح بچھا دیے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار۔ جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوار گیروں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ، چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز کارچوبی تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے۔ فانوس کے کنول بھی سبز چوبوں کے۔ سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موتیا کے گجرے، سہرے کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے کونوں پر مقیش کے گچھے تھے، اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔۔۔ ایک عجیب تماشہ تھا، میں تو الف لیلہ کا ابوالحسن بن گیا تھا۔ جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

واضح رہے کہ اس زمانے میں بجلی تھی نہ اخبار اور نہ مشتہری کے پوسٹر وغیرہ۔ روشنی کا سارا دارو مدار شمعوں، قندیلوں اور چراغوں پر تھا۔ آبادی کم اور دہلی کے موجودہ فصیل بند شہر تک محدود تھی۔ مشاعروں اور دیگر تقریبوں کی خبریں ایک دوسرے کی زبانی آناً فاناً سارے شہر میں مشہور ہو جاتی تھیں اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی ان تقریبات میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس مشاعرے کے لیے جس زمانے (۱۸۴۵ء) کا انتخاب کیا، اس وقت دہلی میں باکمال شاعروں کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا۔ ذوقؔ، غالبؔ۔ مومنؔ، شیفتہ، آزردہ۔ ظفر، صہبائی اور داغؔ کے علاوہ قلعے اور شہر کے بہت سے مشہور اور غیر مشہور شعراء شریکِ محفل تھے۔ ان کی کل تعداد باسٹھ تھی۔ بادشاہ، بہادر شاہ ظفرؔ اور ولی عہد بہادر شریکِ بزم نہیں تھے لیکن ان کا کلام مشاعرے میں سنایا گیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ چونکہ ایک بہت وسیع اور نمائندہ مشاعرے کا منظر نامہ پیش کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اس میں کچھ ایسے شاعروں کو بھی شامل کر لیا جو اس زمانے میں بہت کم سن تھے مگر بعد کے زمانے میں بہت مشہور ہوئے مثلاً نواب مرزا خاں داغؔ، قربان بیگ سالکؔ، ظہیر دہلوی، سکھانند رقم اور علاء الدین خاں علائی۔ مولوی کریم الدین کی کتاب ''طبقاتِ شعرائے ہند'' میں ان شاعروں کا ذکر نہیں ملتا۔

مرزا فرحت نے اس مشاعرے میں شامل ہونے والے شاعروں کی وضع قطع، حلیہ، عادات واطوار، جسمانی شخصیت اور شہرت کے بعض خاص پہلوؤں کے ساتھ ساتھ، ان کے کلام پر اچٹتی سی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔ کسی کے کلام کی تحسین کی ہے، کسی کے بارے میں کہا ہے کہ کلام پھسپھسا اور بے جان ہے، کسی کے لیے لکھا ہے کہ ڈھونڈ کر بلند خیالات اور نازک مضامین کلام میں لاتے ہیں لیکن اس کو نبھا نہیں پاتے۔ حکیم سکھانند کے بارے میں مومنؔ کی زبان سے یہ تبصرہ کروایا ہے ''میاں رقمؔ! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔'' اس فقرے میں نکتہ یہ ہے کہ خود مومنؔ اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے اور اسی پائے کے حکیم بھی تھے اور یہ انھی پر ختم ہے۔ اب دوسرا کوئی حکمت اور شاعری دونوں میں بیک وقت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس فقرے میں وہی مکرِ شاعرانہ ہے جس کے لیے مومنؔ کا کلام مشہور ہے۔ بظاہر سکھانند رقمؔ کو نصیحت ہے مگر در پردہ اپنی عظمت کا گن گان ہے۔ ایک اور شاعر عبدالقادر بیدلؔ کے بارے میں مرزا

فرحت نے یوں تبصرہ کیا ہے۔ ”پڑھتے اس طرح تھے گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہوں۔ اس سے غرض نہیں کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں۔“ مرزا علی بیگ رنگین، ریختی کے شاعر تھے۔ انھوں نے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی اوڑھ کر ریختی کے دلچسپ اشعار سنائے ”قلعے والوں کو اس غزل میں بڑا مزا آیا مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔“ یہ اشارہ مرزا غالب کی طرف ہے جن کا یہ شعر مشہور ہے:

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

محاکات نگاری میں مرزا فرحت کو جو کمال حاصل ہے، اس کا ایک نمونہ منشی محمد علی تشنہؔ کی غزل سرائی کا منظر نامہ ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے:

”اس کے بعد محمد علی تشنہؔ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ رکھ! اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھ پر پڑی تو میاں تشنہؔ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار کر شمع گل کردی اور کہا ”میں بھی کچھ عرض کروں؟“ سب نے کہا ”ضرور۔ فرمایئے!“ انھوں نے نہایت آزاد لہجے میں، کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی:

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے، گل بھی ہے، بُلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے، سب کہتے ہیں یوں ہے، یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

"میں کیا بتاؤں اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والی کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسی عالمِ بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔"

شاعروں کے اس مجمعے میں ایک فرانسیسی نژاد شاعر آزاد بھی تھے۔ ان کے بارے میں مرزا فرحت کہتے ہیں:

"ان کا نام الیگزنڈر ہیڈلے ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی اکیس سال کی عمر ہے۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات چیت اردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہو۔ شعر بھی بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔"

اس مشاعرے میں جو چند بہت اچھی غزلیں پڑھی گئیں، ان میں ایک غزل قاضی نجم الدین برق کی بھی تھی جو سکندر آباد کے رہنے والے ایک نوجوان شاعر اور میر حسن تسکین کے شاگرد تھے۔ اس غزل کا ایک شعر تو کمال کا تھا، جواب بھی کہیں کہیں سننے یا پڑھنے میں آجاتا ہے:

تُو تو جس خاک کو چاہے، وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

مفتی صدر الدین آزادہ کی غزل کا ایک شعر ایسا تھا جو قریب قریب ضرب المثل بن گیا ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

داغؔ، مومنؔ، غالبؔ، اور ذوقؔ کی زبان سے جو جو غزلیں اس مشاعرے میں مرزا فرحت نے سنوائی ہیں، وہ ان کی بہت مشہور و معروف غزلیں ہیں۔ استاد ذوقؔ جب اپنی غزل سناتے ہوئے، آخری شعر پر پہنچے تو اسی وقت برابر کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی اور یہ تاریخی بزمِ مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچی۔ شمعیں بجھا دی گئیں اور نقیب نے آواز لگائی "حضرات! دلی کا آخری مشاعرہ ختم ہوا۔"

دہلی کا یہ آخری یادگار مشاعرہ اگرچہ محض خیالی تھا، جس کو مرزا فرحت اللہ بیگ کے ذہنِ رسا نے اپنے طور پر ترتیب دیا تھا لیکن نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ بالکل اصلی تھا کیونکہ اس میں جو شعراء شریک تھے وہ اس زمانے میں یا اس کے آس پاس کے زمانے میں موجود تھے اور ان کا کلام بھی وہی تھا جو ان کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس میں مرزا فرحت نے کوئی ترمیم نہیں کی۔ اس طرح یہ مشاعرہ خیالی ہوتے ہوئے بھی چاروں کھونٹ اصلی معلوم ہوتا ہے۔

مرزا فرحت نے اس مشاعرے کی جو رننگ کمنٹری کی ہے، اس سے ان کی، شاعری کی پہچان اور پرکھ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے تبصروں میں انھوں نے مبالغے کو بہت کم راہ دی ہے اور وہی کچھ لکھا ہے جو ان کے خیال سے درست تھا۔ اس مشاعرے میں جتنے شاعر تھے، ان میں آدھے قلعۂ معلّٰی کے تھے اور آدھے شہر کے تھے۔ ان کے کلام سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ والوں کے لیے شاعری، چند خاص اصحاب کو چھوڑ کر، عموماً بٹیر بازی اور کبوتر بازی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی، جب کہ شہر سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر شعراء شاعری کو سنجیدگی سے برتتے تھے جس کی وجہ سے ان کا کلام قلعے والوں کی بہ نسبت زیادہ پختہ، پُر کیف اور لطف آمیز ہوتا تھا۔ سارے استاد شعراء بھی شہر ہی میں بود و باش رکھتے تھے اور شاعری کو سنجیدہ اظہارِ فن کے طور پر برتتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ریختہ کے مشاعرے، اس عہد کے کلچر کا ایک لازمی حصہ تھے جس میں بڑے بوڑھے، نوجوان، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، زردار اور بے زر سبھی ذوق و شوق سے شامل ہوتے تھے اور محفل کے آداب اور وقار کو دیکھتے، سیکھتے اور برتتے تھے۔ یہاں ذات پات اور مذہب و مسلک کی کوئی قید نہ تھی، ان میں خواص بھی ہوتے تھے اور عوام بھی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں متوسط طبقے کا وجود نہ تھا۔ پوری سوسائٹی اونچے اور نیچے دو طبقوں میں

بنتی تھی۔

ایک زوال آمادہ تہذیب میں ان مشاعروں کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ چونکہ تفریح کے مواقع کم اور بہت محدود تھے، اس لیے لوگ بڑے شوق سے مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور خوش وقت ہو کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی، دنیا و مافیہا کے غموں کو بھول جاتے تھے۔ مشاعروں کے اس تہذیبی اور افادی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعروں کا ایک مفید پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں بیک وقت شہر کے بیشتر شاعر ایک جگہ اکٹھے ہو کر آپس میں صاحب سلامت کر لیتے تھے اور شاعرانہ چشمکوں کے باوجود رواداری اور اخلاق برتنے میں بخل نہ کرتے تھے۔ یہ مشاعرے نو آمیز شاعروں کی تربیت گاہ بھی تھے، جہاں ان کو شاعری کے رسوم و آداب اور زبان و بیان سے واقفیت حاصل ہوتی تھی اور اپنے کلام کو سنوارنے اور سجانے کی تحریک ملتی تھی۔ مشاعرے اب بھی ہوتے ہیں مگر اب ان کی شکلیں بدل گئی ہیں اور وہ تہذیب کے بجائے تفریح کے ادارے بن چکے ہیں۔

پھول والوں کی سیر

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کو آخری مغل بادشاہ، سراج الدین بہادر شاہ ظفر سے خاص دلچسپی اور عقیدت تھی۔ حق یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر اس محبت اور وابستگی کے حق دار بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں کئی خوبیاں بہ یک وقت جمع ہو گئی تھیں۔ وہ رعایا سے محبت کرنے والے، ہندو مسلم ایکتا کے داعی، اردو کے بہترین شاعر، رقیق القلب اور درد مند انسان تھے۔ پھر ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ان پر جو مصیبتیں پڑیں اور وطن سے کالے کوسوں دور، رنگون میں پانچ سال تک قید و بند کی جو اذیتیں سہیں، اس کی یاد برسوں تک دہلی والوں کو تڑپاتی رہی اور ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگوتی رہی۔ مرزا فرحت بھی دہلی والے تھے۔ انھوں نے غدر کے واقعات بزرگوں سے سنے اور کتابوں میں پڑھے تھے۔ اس زمانے کے تہذیبی اداروں کا حال بھی ان کو بخوبی معلوم تھا، اس لیے انھوں نے اس تہذیب کی آخری بہاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے پہلے "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" قلم بند کیا، پھر "پھول والوں کی سیر" کا حال لکھ کر پرانی یادیں نہ صرف تازہ کر دیں بلکہ اس کی منظر کشی بھی اس خوبی سے کی کہ ایک پورا تہذیبی دور آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔

"پھول والوں کی سیر" کا اصل مقصد تو دہلی والوں کو چند روز تک سیر و تفریح کرنے اور روزمرہ کے معمولات سے نجات دلانا تھا مگر اس سے بھی بڑا مقصد رعایا اور بادشاہ کے درمیان تعلقِ خاطر کو مضبوط بنانا اور آپسی ربط و ضبط میں نئی جان ڈالنا تھا۔ بادشاہ کی نگاہ میں ہندو، مسلم دونوں فرقے برابر کی وقعت رکھتے تھے، اس لیے پھولوں کا ایک پنکھا، پہلے

دن جوگ مایا جی کے مندر پر بڑی دھوم دھام سے چڑھایا جاتا تھا اور دوسرے دن ویسا ہی ایک دوسرا پھولوں کا پنکھا مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر اسی دھوم دھام سے نذر کیا جاتا تھا۔ خود بادشاہ سلامت مہرولی کی ایک بڑی شاہی عمارت کے جھروکے میں بیٹھ کر ان دونوں پنکھوں کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے اور اہالیانِ دہلی نیز امراء و رؤساء سے خراجِ عقیدت قبول کرتے تھے۔ خود بدولت نہ اس پنکھے کے جلوس کے ساتھ جاتے تھے اور نہ اس جلوس کے پنکھے کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے اپنی ہندو مسلم رعایا کو اتحاد اور یگانگت کا سبق سکھاتے تھے۔ میلے کی ابتدا اس طرح ہوتی تھی:

"ساون ختم ہوا، بھادوں لگا۔ چھڑیوں کا زمانہ گیا، پھوار کا زمانہ آیا۔ دتی ولوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفائے دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی (یعنی لال قلعہ) پہنچے۔ اطلاع کروائی۔ باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیرو مرشد! پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورا ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔" بادشاہ نے فرمایا "اماں! ٹھیک تو ہے۔ جو تمھاری خوشی وہ ہماری خوشی۔ پندرہ تاریخ مقرر کر دو۔ رہا ہمارا آنا تو جہاں تم وہاں ہم۔ کیوں نہ آئیں گے!""

اس سے پہلے مرزا فرحت اسی سلسلے کی ایک اور روایت کا حال قلم بند کر چکے تھے جس کا تعلق قلعہ میں راکھی بندھن کی رسم سے تھا۔

"شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے رام کور کو بلایا۔ بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور اس برہمنی کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ تھوڑے دلوں میں سلونوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لیے بہن موتیوں کی راکھی لے کر پہنچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتے داروں کو خلعت دیے۔ لیجیے، راکھی بندھن کی رسم، قلعے کی رسموں میں شریک ہو گئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا، اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ

والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں، بادشاہ اور شہزادوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بادشاہ قلعہ سے چھوٹا۔"

پھول والوں کی سیر کا میلہ کیسے شروع ہوا، اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ اکبر شاہ ثانی، اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ انگریز اس کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ اول تو اس کا حق بڑے فرزند سراج الدین ظفؔر کو پہنچتا تھا اور دوسرے مرزا جہانگیر بہت خودسر اور تند مزاج قسم کے انسان تھے۔ غالباً اسی رنجش میں کہ انگریز ریزیڈنٹ سیٹن، ان کے ولی عہد بننے میں روڑا اٹکا رہا ہے، انھوں نے ایک دن موقع پا کر اس پر گولی چلا دی، ریزیڈنٹ بچ گیا لیکن مرزا جہانگیر کو اس جرم کی پاداش میں قید کر کے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ ان کی والدہ ممتاز محل نے جو بادشاہ کی بہت چہیتی بیگم تھیں، منت مانی کہ اگر مرزا جہانگیر قید سے چھٹ کر آگئے تو وہ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھائیں گی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ان کی منت پوری ہوئی اور مرزا جہانگیر قید سے رہائی پا کر واپس دہلی آگئے۔ ممتاز محل نے اپنی منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ ایک چادر اور پھولوں کی مسہری قطب صاحب کی درگاہ پر نذر چڑھائی۔ مسہری میں آرائش کے لیے پھولوں کا ایک پنکھا بھی لگا تھا۔ سراج الدین ظفؔر نے کہ ایک صاحب ذوق شاعر بھی تھے "پنکھا" کہہ کر بادشاہ کی نذر گزرانی۔

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کے جھلک
کہ وہ ظاہر میں مَلِک اور ہے باطن میں مَلَک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک
آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشیدِ فلک
یہ بنا اس شہِ اکبر کی بدولت پنکھا

مرزا فرحت لکھتے ہیں کہ "بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلّی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا رہے؟ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں، ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلے کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا نیکی اور پوچھ پوچھ، دلّی والے راضی ہو گئے۔ لیجیے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب

جاتے اور وہاں رہتے۔ شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔"

اس موقعے پر خود بدولت بھی قطب صاحب جاتے اور ان کے ساتھ سارے اہالیانِ قلعہ، کیا مرد کیا عورت کیا بچے سبھی کوچ کر جاتے۔ ادھر شہر کے لوگ بھی جوق در جوق اس طرح قطب صاحب کو جاتے کہ پورا شہر دہلی خالی ہو جاتا۔ تین چار دنوں تک سب وہاں کی سیر کرتے اور لطف اٹھاتے۔ اس کا کچھ حال مرزا فرحت نے کتابوں سے اخذ کیا اور زیادہ احوال پرانے بزرگوں سے کرید کرید کر معلوم کیا۔ ان کے زمانے میں دہلی میں پچہتر اسّی سال کے ایسے بزرگ موجود تھے جنھوں نے پھول والوں کی سیر کا میلہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بار بار دیکھا تھا۔ مرزا فرحت نے اس کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں تیار کر لیا اور پھر اس کی رننگ کمنٹری کر کے اور حسبِ ضرورت مکالمے شامل کر کے ایک جیتا جاگتا مرقعہ بنا دیا۔ اس میں جو ڈرامائی فضا موجود ہے وہ مرزا فرحت کے خلاقِ ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جس جلوس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا، اس کی تمام تفصیلات اس طرح پیش کر دی ہیں کہ پڑھنے والوں کے سامنے وہی سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر اہالیانِ قلعہ پہلے سے مقرر کردہ اپنی اپنی سواریوں پر پورے تام جھام کے ساتھ قطب صاحب کے لیے سوار ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"یہ لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے رتھیں، ڈولیاں، نیمے، میانے، پالکیاں، چوپہلے، چنڈول اور سکھپال، موتی محل کے برابر آ لگے۔ شاہزادہ ولی عہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کیے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں۔ جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں، ان کو بلحاظ ان کے درجے کے سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اُردا بیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین سوا تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں، ان کے پیچھے دوسری سواریاں، سب سے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازے پر سواری پہنچی تھی کہ کپتان دگلس قلعہ دار

نے اتر کر سلامی دی۔ دروازے کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک پَرا آگے ہو گیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواریوں کے ادھر ادھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے، کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، ساتوں ہتھیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لے لیا۔ ان کا بھی مردانہ فوجی لباس، گورے گورے چہرے، شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں، سر پر چھوٹا سا عمامہ، اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی، ہاتھ میں چھوٹی برچھیاں، پشت پر ترکش، شانے پر کمان، پہلو میں تلوار، ڈاب میں پیش قبض، بس معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلّی میں گھس آئی ہے۔"

بادشاہ اور قلعہ والے تاریخ سے پہلے ہی قطب صاحب پہنچ گئے تاکہ شہر کے لوگوں کو وہاں پہنچنے میں تکلیف نہ ہو۔ معمولی معمولی باتوں میں بادشاہ اپنی رعایا کی مشکلات کا خیال رکھتے تھے اور رعایا بھی ان سے ایسی محبت کرتی تھی کہ بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے، رات کے بارہ بجے خاص بازار سے لے کر دہلی دروازے تک خلقت کا ہجوم امنڈ آیا تھا۔ چھتوں اور کمروں میں بیٹھی ہزاروں عورتیں شاہی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کا دیدار کرنے کے لیے بےچین تھا۔ یہ سب اس صورت میں تھا کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ تھے۔ حکومت کا سارا کاروبار انگریزوں کے پاس تھا۔ وہی سیاہ و سپید کے مالک بن گئے تھے۔ بادشاہ ان کا محض وظیفہ خوار تھا لیکن اپنی محدود آمدنی میں بھی سارا تام جھام برقرار رکھے ہوئے تھا۔

مہرولی کا پورا علاقہ جہاں خواجہ قطب الدین کا مزار اور جوگ مایا جی کا مندر ہے، پہلے قطب صاحب یا صرف "قطب" کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ وہاں برسات کے موسم کا لطف اٹھانے کے لیے اکثر جایا کرتے تھے، لیکن پھول والوں کی سیر کے میلے کا ایک خاص موقع ہوتا تھا جب بادشاہ اور رعیت دونوں مل جل کر میلے کی رونق بڑھاتے تھے۔ پنکھا تو محض ایک علامت تھا، اس گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کرنے کا اور اسے ایک شکل دینے کا، ورنہ پنکھا کیا تھا؟

'بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو! بانس کی پھچیوں کا بڑا سا پنکھا، بنا پنی چڑھا آئینے لگا، پھولوں سے سجا، ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا

نہ تھا بلکہ جوشِ محبت اور یگانگت کا نشان تھا، جس نے چھوٹے بڑوں، ہندو مسلمانوں، غرباء امراء، غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال کر مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا، بلکہ عقیدت و محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔"

پہلے دن جوگ مایا جی کے مندر پر پنکھا چڑھانے کے بعد، دوسرے دن جب قطب صاحب کے مزار پر پنکھا چڑھانے کی باری آئی تو اس وقت کا یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے:

"کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ بابِ ظفر کے سامنے آکر ٹھہرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف کسی نہ کسی طرح لے چلیں، مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کہا "اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں جوگ مایا جی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں! تمھارے ہندو بھائی کیا خیال کریں گے۔ کہیں گے مسلمان تھا، مسلمانوں کے ساتھ پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غیر سمجھا اس لیے جھروکوں سے نیچے سے بھی نہیں آیا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسروں کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے، اب بھی جائیں گے۔ آتش بازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں۔ وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

میلے میں آتش بازی کا خاص اہتمام ہوتا تھا جس میں آپسی مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ آتش بازی ختم ہونے کے بعد بادشاہ کی طرف سے شال دوشالے، مندیلیں اور سیلے تقسیم ہوتے تھے اور لوگ میلے کی سوغاتیں خرید کر واپس اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے تھے۔

"پھول والوں کی سیر" مرزا فرحت اللہ بیگ کے تین اہم ترین مضامین میں سے ایک ہے مگر اس میں طنز و مزاح کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ یہ ایک تہذیبی تاریخی داستان ہے جسے مرزا فرحت نے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کی عبارت میں محاوروں اور کہاوتوں کی کثرت ہے۔ پورا مضمون ڈیمائی سائز کے ۳۵ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے اور

دہلی کی مخصوص زبان کا عمدہ نمونہ ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں انھوں نے لکھا ہے کہ پھول والوں کی سیر، رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی مگر مرکز اور یکجہتی نہ ہونے کی وجہ سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کو دھیان میں رکھتے ہوئے مولانا آزاد کی ایما پر، پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی کے بعد ۱۹۵۶ء میں یہ میلہ مہرولی میں دوبارہ شروع کروایا جس کی سرپرستی کا اہتمام ایک غیر سرکاری تنظیم "انجمن سیرِ گل فروشاں" کرتی ہے اور ہر سال یہ میلہ دہلی میں ماہ اکتوبر میں منایا جاتا ہے جس میں دہلی کے لفٹینٹ گورنر کو پھولوں کا پنکھا خیر سگالی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک پنکھا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر اور ایک پنکھا جوگ مایا جی کے مندر پر چڑھایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ زمانہ کی الٹ پھیر کے ساتھ اب اس میلے کی شکل و صورت میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اب کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ پھول والوں کی سیر کے لیے مہرولی جائے اور وہاں قیام کر کے اس کا لطف اٹھائے۔ مہرولی پہلے ایک دور دراز کا علاقہ تھا اور دہلی دروازے سے لے کر مہرولی تک ایک سنسان راستہ تھا مگر اب مہرولی سے بہت آگے تک کا علاقہ بھی نئی دہلی میں شامل ہو گیا ہے اور کافی بھرا پُرا اور آباد ہے۔ خدا اس کو ہمیشہ آباد رکھے۔

ڈرامے، خاکے اور دیگر مضامین

مرزا فرحت اللہ بیگ کو ادب کی سبھی اصناف سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے ڈرامے، خاکے، سوانح، تحقیق و تنقید، انشائیے، سفرنامے سبھی میں طبع آزمائی کی ہے۔ کہیں وہ کمزور ثابت ہوئے ہیں اور کہیں ان کی تحریریں بڑی جاندار بن کر ابھری ہیں۔

مضامینِ فرحت میں ایک طویل ڈرامہ "خان بہادر" بھی شامل ہے جو کتاب کے ۷۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ فلموں کے لیے بھی ڈرامے لکھیں گے لیکن اس کا سراغ نہیں ملتا کہ واقعی انھوں نے فلم کے لیے کوئی ڈرامہ لکھا بھی ہے یا نہیں! "خان بہادر" ڈرامے کا موضوع، ان کے زمانے کے دنیادار رئیسوں اور صاف گو وایماندار کرداروں کے بیچ کی کشمکش ہے۔ اس کا پورا قصہ ایک ہی خاندان کے رئیس باپ اور اس کے بیٹوں کے درمیان کھینچ تان پر مبنی ہے۔ بیچ بیچ میں دو تین کردار اور بھی ہیں جو قصے کو آگے بڑھنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کے خاص کردار نواب مظفر، اپنے فرزند رفیع کو دنیاداری کے گر اس طرح سکھاتے ہیں:

"میاں رفیع! ہم تمھاری باتوں سے تنگ آگئے ہیں اور تمھاری اس راست گوئی اور صاف بیانی سے پریشان ہو گئے ہیں۔ بیٹا! یہ دنیا ہے۔ یہاں سچ کو کوئی نہیں پوچھتا جب تک اس میں جھوٹ کی چاشنی نہ ہو۔ اگر سچ کو یہاں فروغ ہوتا تو مولوی عبدالکریم یوں جوتیاں چٹخاتے نہ پھرتے۔ آج کو یہاں کے کمشنر ہوتے۔ ہم لاکھ سر مارتے ہیں کہ دنیا کو دنیادار ہو کر چلاؤ

مگر تم کیا سننے والے اسامی ہو!"

اس ڈرامے کے واقعات کافی دلچسپ ہیں۔ اس میں پرانی اور نئی نسل کی کشمکش بہت موثر انداز میں پیش کی گئی ہے مگر یہ ڈرامہ غالباً اپنی طوالت کے باعث اسٹیج پر نہیں دکھایا جاسکا حالانکہ خود مرزا فرحت اسٹیج کی پیش کش کا بھی تھوڑا بہت تجربہ رکھتے تھے۔ اس ڈرامے میں تین ایکٹ ہیں اور پہلے ایکٹ میں پانچ، دوسرے میں چھ اور تیسرے ایکٹ میں پانچ سین ہیں۔

مرزا فرحت نے ایک خیالی سفر نامہ بھی تحریر کیا ہے جسکا عنوان ہے "جزیرۂ بورینو کا سفر نامہ" اور یہ کتاب کے ۵۳ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور صرف ان کے زرخیز تخیل کی پیداوار ہے مگر اس میں واقعات اور ماحول کی منظر کشی اس طرح کی ہے کہ یہ سچ مچ کا اصلی سفر نامہ معلوم ہوتا ہے۔ یورپی عورتوں اور مردوں کے اطوار و عادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "عورتیں تو خیر عورتیں ہیں، فرانس کے مردوں میں وہ چٹک مٹک ہے کہ ہمارے ہندوستان کے ایک شہر کے سوا (غالباً لکھنؤ) شاید ہی کہیں اور ہوگی۔ بات بات پر ان کا کمر جھکا کر ہاتھ پھیلانا، مضمون سے زیادہ القاب و آداب کی بھرمار کرنا اور کہیں بالکل چپ رہ کر صرف آنکھ کے اشاروں سے مطلب کو پورا کرنا، میرے لیے تو ایک خاصا تماشہ تھا۔"

تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح محض تخیل کے زور سے اور کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں کی مدد سے انھوں نے اتنا لمبا اور زوردار سفر نامہ مرتب کر دیا جس پر بالکل اصلی سفر نامے کا گمان ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کا ایک مضمون "جینے سے بہتر مرنا" ہندوستان سے کوسوں دور، ایک تُرک خاندان کے احوال و افعال پر مبنی ہے جو غالباً خالدہ ادیب خانم کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ترکستان کے ایک گاؤں کے ایک خاص گھرانے کا قصہ اس طرح بیان کیا ہے، جیسے اس خاندان کے تمام افراد سے وہ ذاتی واقفیت رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں بلغاریہ اور ترکی کے درمیان جنگ کی منظر نگاری ایسی ہے جس پر پوری طرح اصلیت کا گمان ہوتا ہے۔

ایک اور مضمون میں مرزا فرحت نے اپنے لڑکپن کے زمانے کی دہلی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی دلچسپ منظر کشی کی ہے۔ چاندنی رات میں جمنا کی ریتی پر طرح طرح کے کھیل تماشے، گانا بجانا،، کھانا پینا اور دھما چوکڑی مچانا، شاید کبھی دہلی کی تہذیبی زندگی کا ایک لازمی حصہ رہا ہو جس کی تفصیل مرزا فرحت نے مزے لے لے کر بیان کی ہے۔ اس مضمون میں جس کا نام "دو دیوانے" ہے، فیروز شاہ کوٹلہ کی وہ نیم تاریخی داستان بھی ہے جو محمد تغلق اور اس کے بھائی فیروز شاہ تغلق سے متعلق ہے۔ یہ داستان ایک روایتی داستان گو، افیم کی گولی اور ملائی کی طشتریاں صاف کرنے کے بعد، وہاں موجود لوگوں کو دلچسپ انداز میں سناتا ہے اور ایک سماں باندھ دیتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ داستان فرضی ہے یا نیم تاریخی ہے مگر جو کچھ بھی ہے اس میں روایتی داستانوں کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

"صاحب بہادر" میں انھوں نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو انگریزوں کی خواہ مخواہ نقل کرتے ہوئے بڑا مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ یہ ایک قسم کا کیری کچر ہے۔ مرزا فرحت کے زمانے میں ایسے کردار بہت ہوا کرتے تھے جو بظاہر خود کو دیسی انگریز ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر موقع ملتا تھا تو چوری چھپے پتوں کے دونوں میں پوڑی اور مٹھائی کھا لینے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ مرزا فرحت کے استاد مولوی نذیر احمد نے بھی ایسے کرداروں کا خاکہ خوب اڑایا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے کئی پرانے شاعروں پر تحقیقی نوعیت کے مضامین بھی لکھے ہیں۔ انھیں میں ایک عمدہ مضمون حکیم آغا جان عیش کے بارے میں بھی ہے جو غالب، مومنؔ اور ذوقؔ کے ہم عصر تھے اور بقول مولانا محمد حسین آزاد، اپنے ایک شاگرد دبدبد کے ذریعے بڑے بڑے استادوں پر چھینٹے کستے تھے۔ تاہم مرزا فرحت نے ان کی باتوں سے اختلاف کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حکیم آغا جان عیش ایک بہت معمولی شاعر تھے جن کے اشعار میں شوخیوں اور چھیڑ خانیوں والی کوئی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ مرزا فرحت نے اس مضمون کی تمہید ہی میں مولانا آزاد کی ڈنڈی ماری کی عادت کو اجاگر کر دیا ہے:

> "آزاد مرحوم استاد ذوقؔ کے عاشق تھے۔ استاد کی جتنی بھی تعریف کی جائے تھوڑی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس زمانے میں ساری دلّی استادوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسے میں استاد ذوقؔ کو آسمان پر چڑھانا آسان نہ تھا۔

آبِ حیات کی قدر بڑھانے کے لیے ظلمات پیدا کرنا اور آئینے کو چمکانے کے لیے چوکھٹے کی چمک کو مارنا پڑا۔ اس گھِسنے گھسانے میں وہ چوکھٹے کا ایک کونہ ہی توڑ بیٹھے۔ دنیا بھر نے غل مچایا کہ حکیم مومن خاں مومنؔ نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ اس مرقعے میں نظر نہیں آتے۔ آپ نے جھٹ اِدھر اُدھر سے ٹکڑا ڈھونڈ، گوند سے چپکا دیا۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر وہ ظفرؔ اور ذوقؔ کے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"غدر ہوا۔ ظفرؔ قید ہوئے، جلاوطن ہوئے، مر گئے۔ آزاد مرحوم نے انکے چاروں دیوان استاد ذوقؔ کے بستے میں باندھ دیے۔ اب خدارا کوئی انصاف کرے کہ کیا طرزِ سخن میں، ظفرؔ اور ذوقؔ دونوں ایک ہیں! کیا ظفرؔ کے چاروں دیوانوں میں کوئی غزل ایسی ہے جو ذوقؔ کی غزل کہی جا سکے!"

اس کے بعد مرزا فرحت نے تحقیق کر کے حکیم آغا جان عیش کا احوال لکھا ہے اور ان کی شاعری کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک بہت معمولی شاعر تھے جو کسی طرح بھی غالبؔ اور مومنؔ کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ مگر آزاد نے آبِ حیات میں ان کو ایک دوسرے ہی روپ میں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ مرزا فرحت نے لکھا ہے کہ اس زمانے کے تذکروں میں شاید ہی ان کا نام کہیں آیا ہو۔ حکیم صاحب کے دو دیوان مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھ آگئے تھے، جن کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد، ان کی شاعری کی کیفیت بیان کی ہے اور مثال میں ان کے بہت سے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ جو کام بھی کرتے تھے، پوری دلجمعی، لگن اور محنت سے کرتے تھے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی اور دو ایک پرانے شاعروں پر بھی اس طرح کا بہت اچھا کام کیا ہے۔ جو پڑھنے کے لائق ہے۔

شاعری

مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاص پہچان اگرچہ مزاح نگار کی حیثیت سے قائم ہوئی لیکن وہ نثر اور نظم کی کسی صنف میں بند نہ تھے۔ ان کو شاعری سے بھی خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے نظم اور غزل کے علاوہ ریختی میں بھی اپنی شوخیٔ طبع کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ''میری شاعری'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں ہر قسم اور ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔ مرزا فرحت کی شاعری کے بارے میں ان کے دوست غلام یزدانی کا خیال ہے کہ ''فرحت کے کلام میں زبان کی لطافت، مضامین کی رنگینی، جدتِ خیال اور حسنِ بیان کے ساتھ اثر بھی موجود ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے میر، غالب، حالی، شبلی سب کے رنگ میں اپنے خیالات کی جولانی دکھائی ہے۔''

اصل بات یہ ہے کہ ''میری شاعری'' میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کا کلام ملتا ہے۔ سنجیدہ غزل میں روایتی مضامین ہیں اور طرزِ ادا میں بھی کوئی خاص جدت نظر نہیں آتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین باندھنے کی قدرت رکھتے تھے اور ٹکسالی زبان اور محاورات کے تو وہ ماہر تھے ہی۔ اس لیے کلام میں پختگی اور سلاست تو ہے لیکن وہ عمومیت کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔ بطور نمونہ یہ اشعار دیکھیے:

شبِ ہجراں گزر گئی لیکن — دل مرا بے قرار ہے اب تک

ہے خزاں، اور دل کے زخموں سے — میرے گھر میں بہار ہے اب تک

اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں — اور مجھے انتظار ہے اب تک

کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا جس کا فرحتؔ، خمار ہے اب تک

ان شعروں میں غزل کا روایتی انداز ہی ملتا ہے۔ فرحت کے زمانے میں حیدر آباد میں امیؔر مینائی اور ان کے شاگردِ رشید جلیل مانکپوری کا رنگ مقبول تھا۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد خود بھی اچھے شاعر تھے اور شاعروں کے سرپرست بھی تھے۔ فانیؔ بدایونی اور صدقؔ جائسی بھی وہاں موجود تھے اور اقبال کا کلام بھی حیدر آباد پہنچتا رہتا تھا لیکن مرزا فرحت کے اشعار دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو اپنے زمانے کے رنگ ہی میں سہی، لیکن ان کی انفرادی شناخت رکھتی ہو۔ کچھ اور اشعار دیکھیے:

دل مرا روزِ ازل سے بے قرارِ نغمہ ہے ہر نفس اس کے لیے آوازِ تارِ نغمہ ہے
ہر مصیبت کیا گزشتہ راحتوں کی یاد ہے نوحہ بھی دیکھو تو گویا، یادگارِ نغمہ ہے
انقلابِ دہر میں جب رنج و راحت کا ہے دَور کیوں دلِ راحت طلب کو انتظارِ نغمہ ہے

کیا نزاکت، کیا ادا، کیا ناز، کیا انداز ہے تیری صورت پر یدِ قدرت کو کیا کیا ناز ہے
ہر نگاہِ ناز گویا، تیرِ بے آواز ہے اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے
بے نیازی اور تیرا ناز ہیں کچھ ایک سے فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز، اس میں ساز ہے

فرحت کی طبیعت میں اک راز ہے سربستہ میکش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہے رندانہ

قطع نظر اس سے کہ دوسرے شعر میں اجتماعِ ردیفین کا عیب موجود ہے، باقی اشعار بھی کچھ خاص لطف نہیں رکھتے اور معلوم ہوتا ہے کہ محض مشقِ سخن کے لیے ہی یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف، ان کے ظریفانہ اشعار میں لطف و لذت کی کمی نہیں کہ یہ ان کی طبیعت کا خاص رنگ تھا۔

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم
کہ دھرے جائیں سدا عشق کے بیگار میں ہم
اس بری طرح پھنسے مجمعِ اغیار میں ہم
گھٹ کے دم، مر ہی گئے کوچہ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی کہ واللہ، کوئی منہ نہ لگائے

کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہم نے مانا کہ سن انیس ہی کی فورڈ سہی
کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں مگر کار میں ہم
چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے
کیا ہوا گر کہیں پٹ بھی گئے بازار میں ہم
مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں
کچھ برے بھی نہیں یوں دیکھو تو دو چار میں ہم
لوگ سمجھیں کہ بھئی، یہ تو بڑے عالم ہیں
بیٹھے رہتے ہیں کتابوں ہی کے انبار میں ہم

اگر وہ خود کو ظریفانہ شاعری ہی تک محدود رکھتے تو ممکن ہے کہ مزاحیہ نثر کی طرح وہ مزاحیہ نظم میں بھی کوئی بڑا کام کر جاتے۔ ان کے زمانے میں اکبر الہ آبادی موجود تھے۔ اودھ پنچ کی دھوم تھی اور ظریفانہ شاعری خوب پھل پھول رہی تھی اور ان کی طبیعت کا خاص رنگ بھی یہی تھا لیکن وہ غزل اور نظم کے پھیر میں پڑ گئے جس میں وہ اپنا کوئی خاص امتیاز نہ قائم کر سکے۔ ظریفانہ شاعری کی ترنگ میں انھوں نے ریختی میں بھی طبع آزمائی کی۔ ریختی کا یہ شعر ان کی یادگار ہے۔

رستے میں دن دہاڑے فرحتؔ نے مجھ کو چھیڑا
میں نے بھی غل مچا کر سر پر اٹھائی بستی

مرزا فرحت اللہ بیگ کی نظموں میں "یادِ وطن" مشہور ہے۔ اس نظم میں دہلی میں جمنا کے کنارے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ منظر نگاری اپنے طور پر ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جس سے ان کی انفرادیت کا پہلو نکلتا ہو۔ بس سیدھی سادی منظر نگاری ہے جس میں مصوری کے بجائے فوٹوگرافی کے عناصر نمایاں ہیں:

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا — رہ رہ کے وہ پھر بادِ سبک سیر کا جھونکا
پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا — اس منظر خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دہلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ — وہ ساڑھیاں ہر رنگ کی، دو ہاتھ کا گھونگھٹ

وہ حسنِ خداداد نہیں جس میں بناوٹ قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا
وہ قسمتِ بیدار کے دن اور وہ راتیں وہ کشمکشِ دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں
اور لطفِ جوانی کے اٹھانے کی وہ گھاتیں فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ باتیں
یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

یہ نظم مخمس کے فارم میں ہے۔ اس کے ہر بند کے پانچویں مصرعے میں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

آتا ہے لیکن اوپر کے آخری بند میں ایک نیا مصرعہ لکھ دیا گیا ہے

یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

مخمس کی روایت سے انحراف مرزا فرحت کی جدت پسندی ہی کہی جا سکتی ہے لیکن اس پوری نظم میں نہ تو بیان کا لطف ہے اور نہ دل کو چھو لینے والی کوئی مصورانہ کیفیت۔ ممکن ہے ان کے زمانے میں یہ نظم پسند کی گئی ہو لیکن اب پڑھیے تو اس میں مزہ نہیں ملتا۔

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو مرزا فرحت کی شاعری، ان کی نثری تخلیقات سے بہت فروتر ہے۔ ان کا مزاج اور رجحان بذلہ سنجی اور خوش مذاقی کی طرف تھا اور اسی میں ان کے جوہر کھلتے تھے۔ شاعری ان کے لیے محض تفریح تھی یا پھر ایک سماجی ضرورت جس کی وجہ سے وہ اس میدان میں کچھ خاص کام نہ کر سکے۔ ان کے دوست غلام یزدانی کی یہ رائے درست نہیں معلوم ہوتی کہ "فرحت دوسرے درجے کے شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو سنجیدہ شاعری ان کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتی تھی۔

نمونے کے مضامین

آگے کے صفحات میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے دو خاص مضامین بطور نمونہ من و عن پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اس کتاب کے قاری ان کی ذہنی اُپج اور اندازِ نگارش کا خود اندازہ لگا سکیں اور خود اپنی رائے قائم کر سکیں۔ ان میں سے ایک مضمون ''ایک وصیت کی تعمیل'' مولوی وحید الدین سلیم کا مزاحیہ خاکہ ہے اور دوسرا مضمون ''بہرا'' برطانوی عہد کے ایک سماجی کردار کا چربہ ہے اور یہ دونوں ہی مضامین ان کے اسلوبِ نگارش کی عمدہ نمائندگی کرتے ہیں۔

مولوی وحید الدین کا خاکہ اگرچہ خود ان کی فرمائش کے بموجب لکھا گیا تھا مگر افسوس ہے کہ یہ ان کے مرنے کے بعد ضبطِ تحریر میں آیا اور سلیم مرحوم خود اس خاکے سے لطف اندوز نہ ہو سکے، حالانکہ اس کی فرمائش انھوں نے مرزا فرحت سے اس وقت کی تھی جب وہ بقیدِ حیات تھے اور مولوی نذیر احمد کی کہانی، رسالہ اردو میں پڑھی تھی اور بہت پسند کی تھی۔ یہ سارا واقعہ اس خاکے کے شروع میں مصنف نے خود اپنے خاص انداز میں بیان کر دیا ہے۔

مرزا فرحت نے مولوی نذیر احمد کی کہانی کی طرح، ایک وصیت کی تعمیل میں بھی صاحبِ خاکہ کی خوبیوں اور خامیوں کو یکساں طور سے اجاگر کیا ہے اور کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی مگر ان کا وصف یہ ہے کہ صاحبِ خاکہ کے کمزور پہلوؤں کے بیان میں بھی بے باکی اور صاف گوئی کے باوجود ایک ہمدردانہ لہر برابر موجود رہتی ہے اور پڑھنے والا شخص ذرا بھی بدظن نہیں

ہوتا۔ اسی طرح ان کے علم و فضل اور خداداد صلاحیتوں کے بیان میں بھی مرزا فرحت نے بخل سے کام نہیں لیا ہے اور ان کے سارے اوصاف کشادہ دلی کے ساتھ دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس خاکے سے مرزا فرحت کی انسانی نفسیات سے واقفیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم کی خِسّت کا جواز ڈھونڈنے میں اور اس کی پیش کش میں انھوں نے کمال کی ذہانت دکھائی ہے اور اسے ایک سے زیادہ زاویوں سے اجاگر کیا ہے۔

اس خاکے میں ان کا ظریفانہ اسلوب بھی کم شوخ و شنگ نہیں ہے اور محاوروں کے استعمال کی وہی خوبی موجود ہے جو ان کے دہلوی اسلوب کی پہچان ہے۔ یہ خاکہ بہت عرصے تک اسکولوں کے نصاب میں شامل رہا ہے اور ان کے بہترین خاکوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ مختصر خاکہ ضرور ہے مگر نذیر احمد کے خاکے کی طرح اس میں بھی مرزا فرحت کی ذکاوت اور ذہانت بہت نمایاں ہے۔

"بہرا" (بیرا) ایک غیر شخصی خاکہ ہے جو برطانوی عہد کے انگریز افسروں کی خانگی زندگی اور معاشرت کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ جن لوگوں نے آزادی سے پہلے، انگریزوں کی معاشرت کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی گھر سے باہر اور گھر کے اندر کی زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گھر سے باہر وہ اپنے کارِ منصبی انجام دینے میں پورے رعب داب اور کروفر سے کام لیتے تھے لیکن گھر کے اندر وہ اپنے عیش و آرام اور امن و آسائش میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے گھر کے انتظامی معاملات، گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے بھی، عموماً بیروں، خانساموں اور آیاؤں کے سپرد رہتے تھے۔ بیشتر حالات میں یہ ہوشیار اور اپنے آقاؤں کے مزاج شناس بیرے اور خانسامے، نہ صرف ان کو لوٹتے اور اپنا جیب بھرتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کے رازدار اور مشیر بھی بن جاتے تھے۔ انگریز اپنے بیروں پر آنکھ موند کر نہ صرف اعتماد کرتا تھا بلکہ اپنا خانگی محافظ اور دم ساز بھی سمجھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو 'ڈیم فول' بھی کہتا تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا۔

راقم الحروف نے خود ایک اسکاٹ اعلیٰ افسر کا حال دیکھا ہے جس کے رعب داب کا یہ عالم تھا کہ فیکٹری کے اندر اس کے قدم رکھتے ہی بڑے بڑے افسروں کو، جن میں ہندوستانی اور انگریز دونوں شامل تھے، سانپ سونگھ جاتا تھا۔ فیکٹری میں وہ جدھر سے گزرتا وہاں سانس لینے کی آواز بھی نہیں سنائی پڑتی تھی۔ ملازمین اور افسران سبھی اس سے

تھراتے تھے۔ دوسری طرف اپنے بنگلے میں وہ ایک کالے، سوکھے، مریل قسم کے لال بیگی بَیرے کا دست نگر رہتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، سننے میں آتا تھا کہ جب کبھی یہ بَیر ازیادہ شراب پی کر زمین پر گر پڑتا تھا تو اس کو اپنے دیگر ملازمین کی مدد سے اٹھاکر بستر پر لٹاتا تھااور اس کی تیمارداری کرتا تھا۔ جب یہ شخص فیکٹری کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن اسکاٹ لینڈ واپس چلا گیا تو جانے سے پہلے اس بَیرے کی پکّی ملازمت کا بندوبست کر گیا۔ وہاں سے وہ اس کو برابر خط بھی لکھتا تھااور کبھی کبھی کچھ رقم بھی بھیجتا تھا۔ تقریباً اسی قسم کے ماحول کی عکاسی مرزا فرحت کے اس مضمون ''بہرا'' میں ملتی ہے۔ یہ کردار اپنی چالاکیوں اور عیاریوں کی بدولت مکان کے اندرونی معاملات میں پوری طرح قابض رہتا ہے اور مختلف بہانوں سے اپنی جیبیں بھرنے میں مشاق ہے۔ اپنی ہوشیاری اور زمانہ شناسی کی بدولت وہ انگریز افسر کے بنگلے کے کسی دوسرے ملازم کی دال نہیں گلنے دیتا، حتیٰ کہ اپنے آگے گھر کی مالکن میم صاحب کی بھی نہیں چلنے دیتا۔ مرزا فرحت کی واقعہ نگاری میں کچھ مبالغے کا عنصر ہو سکتا ہے لیکن یہ اصلیت سے بہت قریب ہے۔ اس مضمون میں طنز کے ہلکے اور گہرے نشتر، بَیرے کے کردار کو خاص معنویت کا حامل بنادیتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض مرزا فرحت اللہ بیگ کی تخیل آرائی نہیں ہے بلکہ اسمیں ان کے مشاہدے کی کارفرمائی کا حصہ خاص کردار ادا کر رہا ہے۔

واضح رہے کہ برطانوی عہد کے انگریز افسروں کے بنگلوں میں کام کرنے والے بیرے، خانسامے، دھوبی اور آیائیں، ان کی خانگی زندگی کا لازمی جزو ہوتے تھے، جن کے بغیر کسی انگریز افسر کے بنگلے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں بنگلے میں اگر میم صاحب نہ بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ہندوستان کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب وہ واپس انگلینڈ جاتے تھے تو زندگی بھر یہاں کے عیش و آرام اور بیروں، خانساموں کو یاد کرتے تھے، خاص کر اس لیے بھی کہ ولایت میں ان کو ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا تھا۔ مرزا فرحت کے یہ دونوں مضامین، ان کے خاص اسلوب کی نمائندگی تو کرتے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بہت دلچسپ اور پُر خیال بھی ہیں۔

ایک وصیّت کی تعمیل

خدا بخشے، مولوی وحید الدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھیے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا۔ پھل نکلے۔ چمک بڑھی اہلِ نظر میں قدر ہوئی، اُس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔ شہرت بھی 'غالب' کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ ادھر نام بڑھا اور ادھر مرا۔ صف سے آگے نکلا اور تیرِ قضا کا نشانہ ہوا۔ چل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحید الدین گئے۔ اب بڑوں میں مولوی عبد الحق رہ گئے ہیں۔ ان کو بھی شہرت کی ریہہ لگ گئی ہے۔ سوکھے چلے جارہے ہیں۔ کسی دن یہ بھی خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ تو جو کچھ تھا سو تھا، ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کا مرنا بھی کچھ عجب مرنا ہو گیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے۔ بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لَو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے۔ ادھر بٹن دبا۔ اُدھر اندھیرا گھپ۔ عظمت اللہ خاں، اسی طرح مرے، مولوی وحید الدین اسی طرح رخصت ہوئے، اب دیکھیں کس کی باری ہے۔ اردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں۔ وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہو جائیں گے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی، مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں

مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں کچھ بے ضرورت جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتہ، آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہو گئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے۔ کئی دفعہ ارداہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں مگر موقعہ نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جسا شاگرد اسکو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا، افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا۔" میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں، مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں، بسم اللہ کیجئے مر جایئے، مضمون میں لکھ دوں گا۔" کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحیدالدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی

صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب، میں اور رفیق بیگ، رفیق بیگ تو سوگئے، ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے عملی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبان اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جاکر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے۔ پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی۔ ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو تو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑا رہا۔

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دفعہ دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا "فرحت تو شاعر ہے، کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر۔" میرے ایک قطعہ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اٹھ قلم دوات نکال کر وہ قطعہ لکھ لیا۔ آپ بھی سن لیجیے، کہتے ہیں کہ نئی طرز کی تاریخ ہے، ہوگی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی کوئی قدر ہے، ہاں قطعے سے پہلے اس کی شانِ نزول سن لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے، پیسہ پاس نہیں تھا، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے۔ ادھر کوشش کی اُدھر کوشش کی، آخر کار سرکار سے منظوری ہو ہی گئی۔ ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا۔ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے۔ عراق، عرب، شام، ترکی غرض سیکڑوں ملکوں کی سیر کی۔ آئے اور بڑی دھوم دھام سے آئے۔ وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ دوستوں نے مجھ سے تاریخ لکھنے کا تقاضا کیا۔ مار مار کر شاعر بنایا۔ تاریخ ہوئی ہے:

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے — بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو — میں بھی شاعر ہوا اللہ کی قدرت ہے مگر

میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
اس لیے لکھتا ہوں تاریخ بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آگیا صیاد کے دل میں شاید
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لیے
خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر
بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر
آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
باندھے صیاد نے پھر طائرِ آزاد کے پر
لکھی "فرحت" نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ
پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی[1] صیاد کا گھر
۲۱۳ ۱۱۲۰

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بندر ہے لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجئے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادّہ بہت تھا۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو برا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ ادھر ادھر سے لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہو گا جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ اِن کے علم، اِن کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان کی طبعِ رسا کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں۔ اور وہ خود بھی اس سے بیزار، مجھ سے بیزار، تم سے بیزار، غرض اپنے سوا ساری دنیا سے بیزار تھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑی شخصیتوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا "ارے میاں! "گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا۔ اور دیکھو تو کون ہیں، نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی اڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے،

---

[1] "پھر" کی جگہ اگر "اور" رکھا جائے تو مادّۂ تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا

سر سید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیہ کیا، اب جو چند روپئی مل رہے ہیں تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے "آگے ناتھ نہ پیچھے پگا" مزے کیجئے بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجئے۔" وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے۔ ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں، واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا، مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہو گا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنا گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہر حال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستے کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز ان کا لکچر تھا۔ طبیعت

صاف نہیں تھی۔ پھر بھی بڑے میاں کو جوش آگیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا۔ اسٹیج پر کرسی بچھادی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے، مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا، مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے، یا ایک برقی رَو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسیّد مرحوم اپنے اکثر لکچر انھی سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسیّد مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ بھی ہو اس میدان میں اِن کا مدِ مقابل نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہو گئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا "یارو، ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔ مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں۔ تمھارا کام جب

ختم ہو جائے تو سیٹی بجادینا۔ میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا۔" اتنا کہہ میں جھٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مولف "طبقاتِ شعراء ہند" سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ ان ہی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتدا اُس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرایہ میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجدوں کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کرلیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے۔" مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کرکے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنادیا۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جاکر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا، جب جاکر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دہلی

آئے بھی تھے یا نہیں۔ کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے۔" کہنے لگے "تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا۔" میں نے کہا "مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے۔" یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے "جی ہاں میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے۔"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، آواز آئی "کون" میں نے کہا "فرحت۔" اس وقت کرتہ پہنے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے، برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے، دو چار چوبا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی ہوئی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں۔ ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجئے، مولوی صاحب کے گھربار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں، سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے۔ چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال دو ایک چکر دے نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے، کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ

مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں۔ کہنے لگے "نہیں بھئی، میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف چائے پر گزران ہے۔" تم مان لو، میں تو نہیں مانتا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ۔ نون کا خرچ۔ غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی پی لی۔ ادھر ادھر گئے، پیٹ بھر لیا، گھر آئے، بان کی کھرّی چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا، ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس ہو، سونے میں تو بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکری میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے۔ غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھیں کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر انھی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے لفظ دماغ سے اتارتے کہ بایدو شاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا، پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس

شاعر کا۔ بھلا ایک لفظ کے لیے کون دیوان کو ڈھونڈ تا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنی ہیں، اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی۔ مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے، اور اردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے، مگر عثمانیہ یونی ورسٹی کے اربابِ حل و عقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اس سرے تک ہندوستان چھان مارو، مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے ان کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

بہرا [1]

کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہم اس مقولے پر ایک نہیں تین صاد کرتے ہیں۔ دور کیوں جایئے خود ہم ہی پر اندازہ کر لیجئے کہ یہ بات صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آئی۔ سی۔ ایس والے نہ ہوتے تو ہندوستان کا کام کیسے چلتا اور اگر ہم بہرا لوگ نہ ہوتے تو یہ بچارے آئی۔ سی۔ ایس کہیں کے نہ رہتے۔ ہے یہ کہ ہندوستان کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کی لگام ہمارے ہاتھ میں ہے۔ خبر نہیں کہ کیوں کانگریس والوں نے ان غریبوں کو بدنام کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہندوستان کی دولت گھسیٹے لیے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ جو وہ کماتے ہیں وہ سارے کا سارا ہمارے ذریعے سے تم ہی کو تو پہنچ جاتا ہے۔ ان کا حساب ہم سے پوچھو۔ بھلا دوسرے گھر کا حال تم کیا جانو۔ سنیے صاحب۔ ہم ان کے گھر کے مالک ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تنخواہ تو تنخواہ۔ ان کے گھروں سے ہی کچھ آ کر یہاں اٹھ جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر ہمارا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو تم سچے ہوتے اور تمھارا کہنا بالکل سچا اور ایسی حالت میں اگر ہندوستان لٹ بھی جاتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ میم صاحبوں والے صاحب کچھ پیسے جمع کر کے لے جاتے ہوں تو لے جاتے ہوں، بن بیاہے بیچارے تو ننگے ہی آتے ہیں، ننگے ہی رہتے ہیں اور ننگے ہی جاتے ہیں۔ بھلا آپ ہی سمجھیے کہ کیا یہ ممکن

---

[1] انگریزی لفظ Bearer جس کو عرف عام میں بیرا کہتے ہیں۔ نہ معلوم کیوں مرزا فرحت نے "بہرا" لکھا ہے جس کا استعمال اونچا سننے والوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ (ن۔ا)

ہے کہ آپ کا ایک بھائی ان لوگوں کے خزانے کی کنجی ہو اور ہندوستان کی دولت کھسک جائے۔ اجی حضرت توبہ کیجیے توبہ۔ یہ کام لکچروں سے نہیں چلتا۔ اس کے لیے ہمت اور عقل چاہیے اور خدا کے فضل سے ہمارے پاس اس کا توڑا نہیں ہے۔ کبھی آ کر ہم سے حساب کتاب کیجیے تو حال کھلے کہ ہم صحیح کہتے ہیں یا آپ۔

یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے دنیا بھر کے اختیارات ان آئی۔ سی۔ ایس والوں کو دے دیے ہیں، مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ان بے چاروں نے اپنے گھر کی ساری حکومت کھانے پینے کا انتظام رکھنے ڈھکنے کا بندوبست، نوکروں کا تقرر اور برطرفی، روپے پیسے کا اٹھانا رکھنا، خرید و فروخت کے اختیارات، سب کے سب ہمارے سپرد کر دیے ہیں اور سچ یہی ہے کہ یہ غریب سارے دن سر مغزنی کر کے آتے ہیں، ان سے کہاں گھر کے انتظام کا وبال اٹھ سکتا ہے۔ اب رہیں میم صاحبیں تو ان کو دوکانداروں کی فہرستیں دیکھنے، اپنے بال بھونری درست کرنے، دوسری میم صاحبوں کی برائیاں کرنے، صاحب لوگوں کی کارروائیوں کی ٹوہ لگانے، شام کو ٹینس کھیلنے، ہوا خوری کو جانے اور ایسے ہی ہزاروں کاموں سے کہاں فرصت ہے جو یہ دیکھیں کہ گھر کیوں کر چل رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی صاحب بہادر اگر کوئی فقیرنی میم صاحب کو لاتے ہیں تو وہ ہمارا بھی ناک میں دم کر دیتی ہے۔ خدا ایسے ندیدوں اور کنجوسوں سے بچائے کہ نہ خود کھائیں نہ دوسروں کو کھانے دیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ بھئی آئی۔ سی۔ ایس والے اچھے اور بہت اچھے، ہاں ذرا ان میم صاحبوں کی وجہ سے بدنام ہو گئے ہیں۔ ہم ایک ترکیب بتاتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بطور تجربہ سرکار اس پر عمل کر لے پھر ہم دیکھیں کہ کون ان کو برا کہتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے بھی تو ہم اس کی گردن مروڑنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ بڑے بڑے حساب دانوں کو گھر کا بجٹ دکھا کر قائل کر دیں کہ ان لوگوں سے ہندوستان کو کیا کیا فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ یہ لوگ چھلنی ہیں، ادھر ڈالا ادھر نکل آیا۔ ہاں تو وہ ترکیب یہ ہے کہ جس طرح آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح ان میم صاحبوں کا بھی امتحان قائم کر دیا جائے اور جب تک کوئی میم صاحبہ اس امتحان میں پاس نہ ہوں ان کا کسی آئی۔ سی۔ ایس سے نکاح نہ ہونے پائے۔ اس امتحان کا نصاب بس یہی ہو کہ تم بڑے لوگ ہو۔ گھر چلانا تمہارا کام نہیں۔ تم ہندوستان کو چلاؤ۔ بہرا لوگ تمہارا گھر چلائیں گے۔ کسی شریف کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے بازاروں میں سامان کا بھاؤ پوچھتے پھرنا

تمھاری شان کے خلاف ہے۔ اگر سامان مہنگا بھی آتا ہے تو کچھ پروا نہیں۔ یہ آئی سی ایس کا گھر ہے، کسی فقیر کا گھر نہیں۔ اگر صاحب کو بہرا لوٹتا ہے تو تم اپنی آیا کا گھر بھر دو۔ اور ایسے ہمت کے کاموں میں ہر گز صاحب سے دب کر نہ رہو۔ تمھارا کام بڑی بڑی شاپوں میں جانا اور دل کھول کر اچھا اچھا اور قیمتی مال خریدنا ہے۔ یہ نہیں کہ دو پیسے کے انڈوں کے لیے ہر ایک کے منہ لگتی پھرو۔ اگر کسی کی برائی کرنا ہے تو اپنے برابر والے کی برائی کرو۔ کسی آئی۔ ایم۔ ایس یا کسی آئی۔ ای۔ ایس کی میم صاحبہ یا صاحب کے کرتوتوں کا پتہ لگاؤ۔ دنیا بھر میں ان کا راز افشا کرو۔ تاکہ گورنمنٹ کو بھی معلوم ہو جائے کہ فلاں میم صاحب شوہر کے معاملات میں بڑی گہری نظر رکھتی ہیں۔ خیر فی الحال اتنے ہی مضمون پڑھا دیے جائیں تو کافی ہیں۔ تجربے کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو ان میں اضافہ، ترمیم یا تبدیلی ہو سکے گی۔ اگر ایسے چنندہ جوڑے آنے لگیں تو پھر دیکھیے کہ ہندوستان کا رنگ ہی بدل جاتا ہے اور خود یہاں والے ان آئی۔ سی۔ ایس والوں کو لالہ دکھن سنگھ اور مولوی دولت خان پر ترجیح دینے لگتے ہیں یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک مچھلی جل کو گندا کر دیتی ہے۔ بعض صاحب بہادر خدا معلوم کہاں سے ادھر ادھر کی پکڑ لاتے ہیں اور ان کی وجہ سے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ بدنام ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بھئی ہم تو یہی کہیں گے کہ ایسے لکھ لٹ دنیا میں شاید ہی کہیں اور ملیں تو ملیں۔ ہماری نظر سے تو گزرے نہیں۔

یہ تو آپ مانتے ہوں گے کہ آئی۔ سی۔ ایس والوں کی لیاقت کے بارے میں:

ہر کہ شک آرد کافر گردد

یہ سمجھنے کے بعد ان لوگوں کی قابلیت کی داد دیجیے جو ایسے لائق لوگوں کی باگ تھامے ہوئے ہیں۔ میں تمام دنیا کی یونی ورسٹیوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا نصاب مرتب نہیں کر سکتیں جس کو پاس کر کے کوئی شخص بہرا بن سکے۔ حضرات یہ علم سینہ ہے، علم سفینہ نہیں۔ سائیسی علم دریاؤ ہے، تو بہرائی علم سمندر رہے۔ خیر اب تو موٹریں نکل کر سائیسوں کے علم کا دریا ہی خشک ہو گیا، اور مجھ سے پوچھو تو پہلے بھی یہ کیا خاک علم تھا۔ مٹھی بھر چنے چبا کر دھوتی میں اڑس لینا بھی کوئی کمال ہے۔ کمال ہمارا ہے کہ لیتے نہیں لوٹتے ہیں، آنکھوں میں خاک جھونک کر لوٹتے ہیں،۔ ڈنکے کی چوٹ پر لوٹتے ہیں، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تڑاپڑ حساب دیتے ہیں کہ صاحب تو صاحب میم صاحبہ کی بھی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

حساب سمجھانے کا یہ کچھ کم کمال ہے کہ اگر کاغذ پر لکھ کر جوڑو تو روپے کے بارہ آنے آئیں اور انگلیوں پر گنو تو اٹھارہ آنے ہو جائیں اور دو آنے خود صاحب کو اپنی گرہ سے بھرنے پڑیں۔ کوئی اس طرح حساب دے کر اپنے علم سے کسی کو قائل کر دے تو ہم جانیں اور یوں بنیوں کی طرح بیٹھے حساب لگانے سے کیا ہوتا ہے۔ کسی صاحب بہادر کی ڈانٹ اور میم صاحب کی گھڑکی کے بعد زبان ہلا سکیں تو ہم بھی مانیں کہ ہاں لالہ جی حساب جانتے ہیں۔

حساب تو حساب جب ہم صاحب کا کوئی راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اس وقت ہمارا رنگ دیکھیے۔ یہ نہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی طرح نوکر چاکروں سے گُن سُن لیتے پھریں یا ماماؤں کی طرح دروازے سے چپک کر دوسروں کی باتیں سنیں۔ اجی ہم وہ ہیں کہ تنے ہوئے سامنے کھڑے ہیں اور صاحب بہادر مزے سے اپنا کچا چٹھا بیٹھے سنا رہے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ خدا ڈیوار (Dewar) اور بکنین (Buchanan) کے کارخانوں کا بھلا کرے۔ وہ وہ وھسکیاں نکالی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جس کو ہاؤس آف لارڈز پلا دی وہ لاٹ صاحب ہو گیا اور جس کے حلق سے کنگ جارج دی فورتھ اتار دی وہ بادشاہ بن گیا اور جس کو وہائٹ ہارس چکھا دی وہ بدرِ منیر کے گھوڑے پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کرنے لگا۔ ہم نے بڑے بڑے صاحب بہادروں کو دیکھ لیا۔ آدھی ہی بوتل میں بلبل کی طرح چہکنے لگتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے دوہرا دی جائیں تو اپنا گلا کاٹ مریں یا ہمارا گلا گھونٹ دیں۔ یہ ہماری عالی ظرفی ہے کہ سب کچھ سنتے ہیں اور زبان پر کچھ نہیں لاتے۔ یہی تو وجہ ہے کہ بعض صاحب بہادر اس ڈر سے کہ کہیں خانہ جنگی نہ ہو جائے، ہمارے ناز اٹھاتے ہیں اور بعض اس خیال سے کہ کہیں نشے میں کوئی سرکاری راز منہ سے نہ نکل گیا ہو ہماری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اور ہمارا یہ نفع ہے کہ پہلا پیگ خالص پلایا، دوسرے میں آدھا پانی ملا دیا اور ہوتے ہوتے خالص پانی پر لا ڈالا۔ اگر کہیں تین چار گھنٹے صاحب اور ان کے دوستوں میں دَور چل گیا تو ہم غریبوں کے پانچ سات روپے سیدھے ہو گئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ رازداری اچھی یا راز کا افشا اچھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ راز کا چھپانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ظرف چاہیے، اور اس کو ڈاٹ لگا کر رکھنے کے لیے صاحب بہادر میں ہمت۔ رازوں میں جتنا اضافہ ہوگا اتنا ہی ان کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔ اور جتنے وہ رو کے جائیں گے اتنا ہی ہمارا رتبہ صاحب کی نظروں میں بڑھے گا۔ انڈوں کی قیمت بڑھے گی،

گوشت کا بھاؤ چڑھے گا تو سلائی کے دام زیادہ ہوں گے، سامان کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ غرض ہر طرف سے آمد ہی آمد کی صورت نکلے گی اور جو کہیں خدا کی قدرت سے اس رازداری میں کسی دوسری طرح کے راز داخل ہوگئے تو پھر کیا پوچھتے ہو۔ صاحب ہمارے اور گھر ہمارا۔ صاحب تنخواہ لائے اور ہمارے حوالے کردی۔ ہم نے مہینے سے پہلے ہی پہلے حساب ان کے ہاتھ دیا۔ اب باقی مہینہ جانے اور صاحب جانیں۔ ادھر ادھر سے قرض دام لے کر انھوں نے پوتھ پورا کیا۔ غرض ہوتے ہوتے صاحب کا یہ کام رہ جاتا ہے کہ مہینہ بھر محنت کرکے تنخواہ مع "اور کچھ" کے لائیں اور ہمارے حوالے کردیں، نہیں تو جانتے ہیں کہ راز کا پٹارا کھلا اور گھر بگڑا۔

بعض بہروں کی بدقسمتی قابلِ افسوس ہے کہ ان کو ایسے صاحب لوگوں سے پالا پڑتا ہے جو دو ہی چلو میں غین ہو جاتے ہیں۔ بھلا ان کے بہرے بچارے اگر مفلس نہ ہوں تو کیا ہوں۔ خیر ہے تو ہمارا نقصان لیکن ہم سرکار کو ایک مشورہ دے دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں یہ شرط لگادی جائے کہ وہی لوگ امتحان میں لیے جائیں گے جو ایک پیگ میں غین ہو سکتے ہیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ گورنمنٹ کے راز بنیے کی گرہنٹ بن جائیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن ہمارے نقصان کی تلافی رعایتی وظیفوں سے بآسانی کی جاسکتی ہے۔ خیر کہنا ہمارا کام ہے۔ ماننا نہ ماننا گورنمنٹ کا کام۔

کچھ رازداری ہی کی وجہ ہے جو ہم کو بہرا کہا جاتا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گونگے کا بہرا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں بہرے کا گونگا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ہمارا خطاب تو دراصل بہرا گونگا ہے۔ لیکن اختصار کے طور پر بہرا کہا جاتا ہے اور اس میں گونگے کا مفہوم بھی پوری طرح آجاتا ہے۔ لوگ آپس میں کچھ ہی باتیں کیوں نہ کریں ہمارا وہاں ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور ہم کو بھی فخر ہے کہ تمام ہائی کورٹوں کی رپورٹیں اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو کہیں نہ ملے گا کہ کسی بہرے نے طلاق کے کسی مقدمے میں گواہی دی یا صاحب اور میم صاحب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی تمام مثلیں چھان ڈالیے آپ کہیں نہیں پائیں گے کہ کسی بہرے نے راز افشا کیا۔ بعض میم صاحبوں کی باتوں سے دل تو بہت جلتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ اس گھر کے گھر کو آگ لگادیجئے مگر ہم لوگ شریف ہیں، مصیبتیں جھیلتے ہیں، تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ جس گھر کو جھاڑو دے

کر صاف کیا ہے اس کو پھونک بھی دیں۔ ایسے تنگ نظر دیسی لوگ ہوتے ہیں۔ ہم ولایتی نوکر ہیں بھلا ہم اور ایسی رکیک حرکتیں کریں۔

اس خدمت کی وقعت کے متعلق مجھ سے پوچھو تو میں یہی کہوں گا کہ بہرا جیسی ہستی ساری دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ ہاں مقابلے پر آپ کسی کو لا سکتے ہیں تو وہ ”آیا اماں“ ہیں مگر توبہ کیجئے کہاں وہ اور کہاں ہم۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، بھلا لومڑی اور شیر کا کیا مقابلہ، رذیل کو شریف سے کیا نسبت۔ آیا اماں لاحول ولا قوۃ، چغلیاں وہ کھائے، لگائی بجھائی وہ کرے، جھوٹ وہ بولے، ضرورت ہو تو صاحب سے نظربازی وہ کرے، میم صاحب کی برائیاں دنیا میں وہ پھیلائے اور مزا یہ ہے کہ پھر میم صاحب کی رازدار کہلائے۔ نوچ نوچ کر کھائے اجی حضرت اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پرکھنے والے پر کیا دوش۔ ہمارے ملک کی یہ نالائق عورتیں ہی بچاری میم صاحبوں کو بہکاتی ہیں ورنہ وہ غریب کیا جانیں کہ بیگن کا کیا بھاؤ ہے۔

میں بھی ایک دفعہ اسی چکر میں آچکا ہوں۔ ہمارے صاحب، سبحان اللہ کیا تعریف کروں بڑے میاں آدمی تھے۔ ہم ہی گھر چلاتے۔ ہم ہی کھاتے اور ہم ہی کھلاتے۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ولایت جاکر نا معلوم کہاں سے ایک زرغل کو بیاہ لائے۔ صورت دیکھو تو چماریوں کی سی دماغ دیکھو تو پریوں کا سا۔ میم صاحب کے آتے ہی ان کی دُم یعنی اماں بھی آ براجیں۔ یقین مانیے کہ ایسی بدمعاش تھی کہ خدا کی پناہ! آتے ہی پہلے مجھ سے سوال کیا کہ ”بہرا بھائی، ہم کو کیا حصہ ملے گا؟“ میں ٹھہرا گھر کا مالک، اس زور سے ڈانٹا کہ گھبرا گئی۔ سمجھ گئی ہوگی کہ یہاں دال گلنا ذرا مشکل ہے۔ میم صاحب سے مل کر بہرا کو چلتا کرنا چاہیے۔ میم صاحب کو ہماری زبان نہیں آتی تھی مگر ظالم نے خدا جانے کہاں کہاں سے کتابیں منگوا کر تھوڑے ہی دنوں میں خاصی سیکھ لی۔ پہلے شاید کوئی گالیوں کی کتاب منگوائی تھی کیونکہ آنے کے مہینے بھر کے اندر ہی اندر خاصی موٹی موٹی گالیاں دینے لگی۔ اس کے بعد کچھ اور بڑھا۔ ایک دن چائے پیتے پیتے کہنے لگیں ”دل، بہرا، جنٹ صاحب کے ہاں انڈا پیسے کو آتا ہے۔ تم دو آنہ کیوں لیتا ہے، صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے، مگر بیوی کے تیور دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ میں سمجھ گیا کہ آیا اماں کا یہ پہلا وار ہے۔ میں نے کہا حضور جس طرح جنٹ صاحب کے ہاں انڈے آتے ہیں، اگر اجازت ہو تو اس طرح پیسے کے چار انڈے لادوں۔ بات یہ تھی

کہ جنٹ صاحب ذرا کچھ ۔۔۔۔۔ بس رہنے دیجئے کیوں دوسروں کا عیب کھولوں۔ یہ حال میم صاحب کو بھی معلوم تھا۔ کہنے لگیں ہم اس طرح کا انڈا نہیں مانگتا۔ دروازے سے لگی ''آیا اماں'' کھڑی تھیں سمجھ گئیں کہ یہ استادی وار خالی گیا۔ دو تین روز دے کر اس چڑیل نے دوسرا حملہ کرایا۔ صبح حاضری پر میم صاحب آئیں۔ ایک انڈا اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگیں ''دل جنٹ صاحب کی بات ٹھیک نہیں۔ گڑھ کپتان کے ہاں تین پیسے کو انڈا کیوں آتا ہے۔'' میں نے کہا ''حضور وہ غلیظ انڈے کھاتے ہیں۔ ہمارے صاحب کے ہاں اول نمبر کے انڈے آتے ہیں۔'' میم صاحب کچھ منہ بنا کر چپ ہو رہیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس شام کو میم صاحبہ اور صاحب موٹر میں ہوا خوری کو نکلے۔ مجھے پیچھے بٹھا لیا۔ ایک گلی میں سے گزرنے لگے تو میں نے دیکھا کہ بہت سی مرغیاں ڈلاؤ کرید کرید کر کھا رہی ہیں۔ بھلا ایسا موقع ملے اور میں جانے دوں۔ میں نے کہا ''دیکھیے میم صاحبہ یہیں سے گڑھ کپتان صاحب کے ہاں انڈے جاتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں بھی کل سے اِنھی مرغیوں کے انڈے لایا کروں۔'' صاحب بولے ''ہم ایسا برا انڈا نہیں مانگتا۔'' میم صاحب بھی ذرا چپ ہوئیں۔ میں نے کہا صاحب! آپ کے ہاں اصیل کے انڈے آتے ہیں۔ واجد علی شاہ بادشاہ تھے۔ ان کو خاندانی مرغیوں کا بڑا شوق تھا۔ کابل سے مرغیاں منگوائی تھیں۔ ان مرغیوں کا خاندان اب تک چلا آرہا ہے میں تو وہیں سے انڈے لاتا ہوں۔ گھر پر آنے کے تھوڑی دیر آیا اماں کو دیکھا تو ذرا جھیپی جھیپی سی تھیں۔ دبی دبی زبان ہی مجھ سے پھر پتی کو کہا میں نے کہا ''چل چڑیل، پہلے دیتا بھی تھا تو اب کوڑی نہیں دوں گا۔ جا اپنی اماں کو اور بھڑکا۔ اس گھر میں یا تو رہی یا میں رہا۔'' جل کر کوئلہ ہو گئی۔ انڈوں کی بحث ختم نہ ہوئی تھی کہ گوشت کے بھاؤ پر جھگڑا اچلا۔ میں نے لاکھ سر مارا کہ صاحب اچھا گوشت بارہ آنے سیر سے کم نہیں ملتا مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ بازار میں گوشت کا بھاؤ ساڑھے چھ آنے سیر تھا۔ آیا اماں اپنے پاس سے پیسے ملا چار آنے سیر ہی لے آئیں۔ میں نے اس دن صاحب سے ایک روز کی چھٹی لی لیکن چلتے چلتے چپکے سے گوشت پر جمال گوٹہ بُرک گیا۔ کوئی رات کے نو بجے ہوں گے کہ چپراسی بھاگتا ہوا آیا اور کہا چلو صاحب اور میم صاحبہ کا برا حال ہے۔ آکر کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں نڈھال پڑے ہوئے ہیں۔ سیول سرجن بلائے گئے انھوں نے نسخہ لکھا۔ میں نے خوب غل مچایا کہ ڈاکٹر صاحب بھلا مرے ہوئے جانوروں کا گوشت چار آنے سیر منگوا کر کھایا

جائے گا تو آخر کیا ہوگا۔ سر پٹکتا رہا کہ میم صاحبہ خدا کے واسطے اس آیا کی باتوں میں نہ آیئے بھلا میری کون سنتا ہے۔ سمجھے ہوں گے کہ کوئی اپنی غرض ہے جو ایسی باتیں بناتا ہے۔ ہم نے صاحب کے پیچھے اپنا گھربار تباہ کرلیا، کمشنر صاحب دوگنی تنخواہ دے کر لے جارہے تھے ان کو صاف جواب دے دیا کہ جس صاحب کے ہو رہے اس کے ہو رہے۔ لیجئے اس کا یہ بدلہ ملا کہ ہم جھوٹے ہوئے اور یہ چار دن کی آیا سچی ٹھہری۔ دیکھ لیجئے کیا نتیجہ ہوا اور کہیں خدانخواستہ صاحب یا میم صاحبہ کو کچھ ہو جاتا تو ہم جیتے جی مر گئے تھے۔ یہ کہہ کر میں نے ذرا آنکھیں ملیں، آواز میں بھی رونے کا کچھ رنگ پیدا کیا۔ ہوا یہ کہ صاحب اور میم صاحبہ کو تو اچھا ہونا ہی تھا وہ دونوں تو اچھے ہوگئے ہاں۔ آیا۔ اماں جان۔ دوسرے ہی دن نکالی گئیں اور پھر وہی دو آنے انڈا اور بارہ آنے سیر گوشت کا بھاؤ چلنے لگا۔

ہمارے طبقے میں اگر کوئی کمزوری ہے تو بس یہ ہے کہ ہماری عورتیں آیا بننا نہیں چاہتیں۔ یہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھتے ہو۔ ہندوستان کو کل سوراج مل جائے۔ اور مجھ سے پوچھو تو آیا بننا ہی کیا بڑا کام ہے۔ سوا دو روپے کی دو ساڑیاں بارہ آنے کی دو چولیاں اور ڈیڑھ آنے کی دو لکڑی کی مرکیاں۔ چلو ایک روپیہ سوا چودہ آنے میں آیا ہوگئے۔ [1]

بہر حال اس حرافہ سے چھٹکارا پاکر میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تیسرے دن دوسری آیا آگئی۔ یا تو اس کو پہلے ہی سے میری لیاقت کی خبر ہوگئی تھی یا یہ خود غریب طبیعت کی تھی۔ ہوا یہ کہ ادھر میں نے سوچا کہ مل بانٹ کر کھانا اچھا ہے۔ ادھر اس نے خیال کیا کہ جو مل جائے وہی غنیمت ہے۔ ایک آنے روپے پر تصفیہ ہوگیا۔ کچھ دنوں امن چین سے گزری لیکن کیا کیا جائے، دنیا کسی بھلے آدمی کو آرام سے کب بیٹھنے دیتی ہے۔ کلب کی میم صاحبوں نے ہماری میم صاحب کو بھڑکانا شروع کیا۔ ایک بڑے پرانے گھاگ جنٹ صاحب بدل کر ضلع میں آئے۔ ان کی میم صاحبہ کو اپنی گھرداری کی قابلیت جتانی تھی۔ جب تک کلب میں رہتیں اپنی تعریف کرتیں۔ اپنے تجربے بیان کرتیں۔ اپنی جمع پونجی کا ذکر کرتیں کہ جو کچھ ہو سکے یہاں سے گھسیٹ لو نہیں تو ولایت جاکر ساری کسر نکل جائے گی۔ آخر بڑھیا کی کہاں تک کوئی نہ سنتا۔ سارے بنگلوں میں روپے پیسے کا رونا مچ گیا۔ ہماری میم صاحب بھی

---

[1] براہ کرم کوئی صاحب۔ قم جوڑ کر اس میزان کی صحت پر اعتراض نہ فرمائیں۔ یہ بہر اؤں کا حساب ہے وہ جو کچھ کہیں سب صحیح ہے۔ (مصنف)

پھر گئیں۔ ایک دن کہنے لگیں "ول بہرا بڈھی میم صاحب کے ہاں مہینے بھر میں پالش کی ایک شیشی ختم ہوتی ہے۔ تم آٹھ شیشیاں اٹھاتا ہے۔ ہم پسند نہیں کرتے۔ میں سن کر چپ ہو رہا۔ دوسرے دن صاحب کا بڑا بوٹ صبح ہی سے لے جا دھوپ میں ڈال دیا۔ جب صاحب کچہری سے آکر میم صاحب کے ساتھ چائے پینے بیٹھے اس وقت میں نے کہا "حضور دیکھیے پھر وہی پہلے والی بات ہونے لگی ہے۔ میم صاحب کہتی ہیں کہ پالش کی ایک شیشی مہینے بھر چلاؤ۔ میں آپ کا جوتا ابھی لاتا ہوں اور آپ کے سامنے پالش کرتا ہوں۔ آپ خود دیکھیے کہ کتنا پالش کھاتا ہے۔" یہ کہہ میں جوتا اٹھا لایا۔ ایسا جل رہا تھا جیسے آگ۔ ادھر میں نے پالش اس پر لگایا ادھر جذب ہو کر رہ گیا۔ ساری کی ساری شیشی ایک ہی جوتا کھا گیا۔ صاحب بیٹھے اخبار پڑھتے رہے۔ میم صاحب یہ تماشہ دیکھتی رہیں۔ آخر گھبرا کر کہنے لگیں۔ "ول بہرا یہ کیا بات ہے۔" میں نے کہا "حضور ہمارے صاحب کے جوتے فس کلاس چمڑے کے ہیں، زیادہ پالش کھاتے ہیں۔ اگر ان کو اچھی پالش نہ دیا جائے تو ستیاناس ہو جائیں۔ بڈھی میم صاحب کے یہاں بھلا ایسے جوتے کہاں سے آئے، وہ ایک ایک پیسے پر تو جان دیتی ہیں، سوا سوا روپیہ والا جوتا خود پہنتی ہیں، اور اپنے صاحب کو تو چودہ آنے والا ہی لا کر دیتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک شیشی بھی بہت خرچ ہوتی ہے۔ آپ بھی ویسے ہی جوتے پہننے لگیں تو مہینے بھر کا کام میں آدھی شیشی میں ہی چلا دوں۔"

معلوم نہیں میم صاحب کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر مجھے آیا سے معلوم ہوا کہ انھوں نے بڈھی میم صاحبہ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ بھلا وہ بے چاری اس بہرائی علم کو کیا سمجھ سکتی تھیں۔ کچھ الٹی سیدھی وجہ بتلائی مگر ہماری میم صاحبہ کی سمجھ میں نہیں آئی اور پالا ہمارے ہی ہاتھ رہا۔ ایک دفعہ شکایت کر بیٹھیں کہ مٹی کا تیل بہت خرچ ہوتا ہے۔ میں نے ان کے سامنے لیمپ میں تیل ڈالا۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ بتی کو پہلے سے کافور کے پانی میں بھگو دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھی رات کو سارا تیل خرچ ہو کر لیمپ ٹھنڈا ہو گیا۔ غرض کہاں تک لکھوں۔ روز ایک نیا جھگڑا نکلتا ہے اور یہ ہم لوگوں ہی کی ہمت ہے کہ اس کو اپنی لیاقت سے سلجھاتے ہیں ہماری جگہ کوئی دوسرا ہو تو پاگل ہو کر بھاگ نکلے۔

اس کے بعد کچھ ایسا چکر پڑا کہ صاحب کے تو ہم پہلے سے رازدار تھے ہی، میم صاحبہ کے بھی رازدار ہو گئے۔ اس کے بعد سارا گھر ہمارا ہونے میں کیا کسر رہی۔ آیا کے

ساتھ ہم نے یہ سلوک کیا کہ منافعے میں سے ایک آنے روپے کے بجائے پیسہ روپیہ بطور خیرات اس کا بھی مقرر کردیا۔ اب بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ آیا نوکر تو میم صاحبہ کی ہے مگر ہماری غلام ہے۔ صاحب نوکر تو سرکار کے ہیں مگر ہمارے دست نگر ہیں۔ میم صاحبہ ہیں تو سرکار کی بیوی مگر ہم سے ترساں ولرزاں ہیں۔

تو حضرات میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ بہرائی علم سمندر ہے۔ یہ نہیں کہ اونچا صافہ باندھ لیا، داڑھی چڑھالی، اچکن پہن لی، پٹکا لپیٹ لیا اور بہرا ہو گیا۔ بہرا بننے کے لیے شکرے جیسی تیز آنکھیں، چیتے جیسی سبک چال، الّو جیسی متانت، لومڑی جیسی چالاکی، شیر جیسی ہمت اور اونٹ جیسا تحمل چاہیے۔ نہیں تو بہرا ہر شخص بن جائے گا مگر کنارے پر ہی غوطہ کھائے گا اور وہیں ڈوب کر مر جائے گا۔ شیخ سعدی نے صحیح فرمایا ہے

نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند

تتمہ

مرزا فرحت اللہ بیگ، دہلی والے تھے اور دہلی کی اس تہذیب کی یادگار تھے جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد تیزی سے معدوم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ پر ایک نئی تہذیب کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ اس نئی تہذیب میں مغربی افکار و خیالات کا عمل دخل تھا جو ماضی کی تقریباً سبھی تہذیبی قدروں کو ملیامیٹ کردینے کے درپے تھی۔ اکبر الہ آبادی نے اس تہذیب پر بند باندھنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے اور آخر میں یہ کہہ کر اپنے بال و پر سمیٹ لیے کہ ۔

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اکبؔر
بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

مرزا فرحت نے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن ان کی یہ کوشش ضرور رہی کہ وہ پرانی تہذیب کے نقوش، جہاں تک ہوسکے کاغذ پر محفوظ کرلیں۔ چنانچہ نذیر احمد کی کہانی 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'، 'پھول والوں کی سیر'، 'نانی چندو'، 'نئی دہلی' وغیرہ ان کے اسی قسم کے مضامین ہیں جن میں پرانی تہذیب کے بہت سے نقوش محفوظ ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ پرانی تہذیبی قدروں کے ایک اچھے وقائع نگار تھے لیکن ان کی اصل شہرت بہ حیثیت مزاح نگار قائم ہوئی۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے ممتاز مزاح نگاروں میں مرزا فرحت کی حیثیت کسی دیگر مزاح نگار سے کم نہیں۔ ان کی تحریروں میں بڑی شوخی اور شگفتگی ہوتی تھی لیکن ان کا مزاح قہقہہ بردوش نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک طرح سے یہ خوش مذاقی کے زمرے کا مزاح تھا، جس میں طنز کی کیفیت بہت کم ہوتی تھی۔ وہ

شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی اور پطرس کے ہم عصر تھے لیکن ان کے مزاح کا دار و مدار بیانِ واقعہ پر تھا، نفسِ واقعہ پر نہیں تھا۔ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھنے میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ دہلی کا روزمرّہ اور محاورہ، ان کے نوکِ قلم پر رہتا تھا۔ انھوں نے ''میری داستان'' کے علاوہ کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن مضامینِ فرحت کی سات جلدوں میں ہر طرح کے مضامین موجود ہیں، سنجیدہ بھی اور مزاحیہ بھی جن سے آج بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے مگر اب یہ کتابیں بہت کم یاب ہیں۔ شاید اسی دشواری کے پیشِ نظر، ڈاکٹر اسلم پرویز نے ''مرزا فرحت اللہ کے مضامین'' کے نام سے ان کے مضامین کا ایک عمدہ انتخاب پیش کیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ جیسے مقتدر مزاح نگار پر اب تک کسی یونیورسٹی میں تحقیقی کام نہیں ہوا ہے جبکہ گلی کوچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی ''حیات و خدمات'' پر تحقیقی مقالوں کی بھرمار ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی ادبی رسالے نے ان کے ادبی کارناموں پر مشتمل کوئی خاص نمبر بھی نہیں شائع کیا ہے، حالانکہ ادبی تاریخ کی تمام کتابوں میں ان کے نام اور کام کے بارے میں برابر لکھا جا رہا ہے اور ہر جگہ ان کو ایک اہم مزاح نگار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مزاح نگار، وقائع نویس، شاعر، مصور، خاکہ نگار، فوٹوگرافر، ڈرامہ نویس اور اداکار و ہدایت کار سبھی کچھ تھے لیکن اس کثرتِ شوق کے باوجود ان کا کوئی کام ادھورا، خام یا کم عیار نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے جس چیز کو بھی ہاتھ لگایا، کوشش یہی کی کہ نقشِ خام نہ رہ جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے سارے مضامین یکساں قدر و قیمت کے نہیں ہیں۔ کچھ مضامین اعلیٰ پائے کے ہیں تو کچھ مضامین ہلکے اور کمزور بھی ہیں۔ عزیز احمد کا خیال ہے کہ وہ نذیر احمد کی کہانی کے معیار کا کوئی دوسرا خاکہ نہیں لکھ پائے، حالانکہ مولوی وحید الدین سلیم کا خاکہ بھی، اپنے اختصار کے باوجود، نذیر احمد کی کہانی کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔

مرزا فرحت نے نظیر اکبر آبادی، حکیم آغا جان عیش، خواجہ امان، انعام اللہ خاں یقین اور سید انشا کے کارناموں پر جو ادبی مضامین لکھے ہیں وہ بہت مفید اور کارآمد ہیں اور ادب کا طالب علم ان سے آج بھی بہت کچھ اخذ کر سکتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ شروع میں 'مرزا الم نشرح' کے فرضی نام سے مضامین لکھتے

تھے۔ نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، پہلی مرتبہ ان کے اصل نام کے ساتھ مولوی عبدالحق کے رسالے "اردو" میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد انھوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا اور وفات سے چند سال قبل تک سرکاری ملازمت کے خرخشوں کے باوجود، وہ پوری دلجمعی سے لکھتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو کے نثری ادب کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافے کیے اور مزاح نگاری کا اپنا ایک خاص اسٹائل بنایا، جو بذلہ سنجی اور خوش مذاقی سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی مزاح نگاری سے ملک اور قوم کی اصلاح کے دعوے نہیں کیے اور سماج سدھار کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ ان کا مقصد پڑھنے والوں کے لیے انشراحِ قلب کا سامان مہیا کرنا تھا اور یہ کام انھوں نے بہت خوبی اور اطمینان سے کیا۔ وہ اپنے پیشروؤں میں کسی کے مقلد نہیں تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر لکھا اور سنجیدہ و مزاحیہ دونوں طرح کے مضامین میں اپنی تخلیقی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے نام اور کام کے نقوش آسانی سے مٹائے نہیں جا سکتے۔

مختصر ببلوگرافی

۱۔ مضامینِ فرحت حصہ اول تا ہفتم

۲۔ میری داستان حیدر آباد مطبوعہ ۱۹۷۷ء

۳۔ یادگارِ فرحت حیدر آباد مطبوعہ ۱۹۵۱ء

۴۔ میری شاعری از مرزا فرحت اللہ بیگ

۵۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین (انتخاب) مطبوعہ ۱۹۸۹ء

۶۔ مختصر تاریخ اردو ادب از ڈاکٹر سید اعجاز حسین مطبوعہ ۱۹۸۴ء

مرزا فرحت اللہ بیگ، اس صدی کے نصف اوّل کے ایک اہم مزاح نگار تھے۔ انھوں نے ڈرامے، خاکے اور دیگر سنجیدہ ادبی مضامین بھی لکھے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر بطور مزاح نگار ہی آتا ہے۔

وہ سابق ریاست حیدر آباد کی عدلیہ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے مگر لکھنے پڑھنے کا شوق بہت تھا اور اپنی دوسری مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کا وقت نکال ہی لیتے تھے۔ ان کے کئی مضامین اردو زبان کے نصاب میں شامل ہیں لیکن ان کی تصنیفات پر اب تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے، حالانکہ معیار اور مقدار دونوں کے لحاظ سے مرزا فرحت اس کے مستحق ہیں۔

ہندوستانی ادب کے معمار سلسلے کی اس کتاب میں ان کے فکر و فن کا جائزہ لینے اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مؤلف جناب نامی انصاری، اردو کے ایک سرگرم ادیب اور شاعر ہیں۔ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے اور تین نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم پر ان کا مونوگراف، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا تھا۔